

# الرساله

Al-Risala

May 2021 • Rs. 30

آخرت میں صرف اس شخص کو خدا کا دیدار حاصل  
ہوگا، جس نے دنیا میں خدا کو دیکھنے کی نگاہ پیدا کی ہو۔

زیر سرپرستی  
مولانا وحید الدین خاں  
صدر اسلامی مرکز  
فہرست  
ڈائری سے انتخاب

# الرسالہ

May 2021 | Volume 46 | Issue 5

www.cpsglobal.org

Al-Risala Monthly  
1, Nizamuddin West Market  
New Delhi 110013

Mobile: +91-8588822679

Tel. 011-41827083

Email: cs.alrisala@gmail.com

## Annual Subscription Rates

Retail Price	₹ 30/- per copy
Subscription by Book Post	₹ 300/- per year
Subscription by Regd. Post	₹ 400/- per year
Subscription (Abroad)	\$20 per year

## Bank Details

Al-Risala Monthly

Punjab National Bank

A/c No. 0160002100010384

IFSC Code: PUNB0016000

Nizamuddin West Market Branch

**Paytm**

Mobile: 8588822679



To order books of Maulana Wahiduddin Khan, please contact Goodword Books

Tel. 011-41827083, Mobile: +91-8588822672

Email: sales@goodwordbooks.com

## Goodword Bank Details

Goodword Books

State Bank of India

A/c No. 30286472791

IFSC Code: SBIN0009109

Nizamuddin West Market Branch



17 ستمبر 1985

ہر آدمی کے اندر ایک انسان ہے، اور اسی کے ساتھ اس کے اندر ایک شیطان بھی چھپا ہوا ہے۔  
اکثر لوگ اپنی نادانی سے انسان کو کھودیتے ہیں۔ یہ صرف شیطان ہے جو ان کے حصہ میں آتا ہے۔

28 اکتوبر 1985

رمضان کے بارے میں مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ ان میں سے ایک  
روایت یہ ہے: وَصُفِّدَتِ الشَّيَاطِينُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1079)۔ یعنی اور اس ماہ میں  
شیاطین قید کر دیے جاتے ہیں۔

حدیث کے الفاظ کو اس کے ظاہری مفہوم میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ رمضان کے  
مہینے میں تمام دنیا کے شیاطین علی الاطلاق (absolute sense) قید کر دیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ  
بات بداہتہ (prima facie) خلاف واقعہ ہے۔ کیوں کہ دیکھنے میں آتا ہے کہ رمضان کے مہینہ  
میں وہ تمام گناہ بدستور ہوتے رہتے ہیں جو سال کے دوسرے مہینوں میں ہوتے ہیں۔

اس لیے حدیث کا مفہوم قید کے ساتھ لینا ہوگا۔ یعنی یہ کہ سنسیرٹی (sincerity) کے ساتھ  
روزہ رکھنے والوں کے لیے اللہ کی مدد آتی ہے، اور شیاطین کا ان پر غلبہ نہیں ہو پاتا ہے۔ یعنی جو لوگ  
سچی اسپرٹ کے ساتھ روزہ رکھتے ہوں ان کے اندر رمضان میں گناہوں کی تحریک نہیں ہوتی یا بہت  
کم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں کی حالت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّ عِبَادِي  
لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ (15:42)۔ یعنی بیشک جو میرے بندے ہیں،  
ان پر تیرا زور نہیں چلے گا۔ سو ان کے جو گمراہوں میں سے تیری پیروی کریں۔

حدیث ایک دعوتی اور تربیتی کلام ہے، اور دعوتی اور تربیتی کلام میں یہی انداز زیادہ مؤثر  
ہے۔ منطقی اسلوب دعوت و تربیت کے لیے مؤثر نہیں۔ اگر یہ کہا جاتا کہ ”جو روزہ دار پورے شرائط و  
آداب کے ساتھ روزہ رکھے اس کے شیاطین قید کر دئے جائیں گے“ تو کلام کی تاثیر نسبتاً کم ہو جاتی۔

عبدالرحمن بن عبدالقاری تابعی (وفات 80ھ) کہتے ہیں کہ میں رمضان کی ایک رات خلیفہ ثانی عمر بن خطاب کے ساتھ مسجد گیا۔ اس وقت لوگ مختلف حالتوں میں (نماز ادا کر رہے) تھے۔ کوئی تنہا نماز پڑھ رہا تھا، اور کوئی چند آدمیوں کے ساتھ۔ حضرت عمر نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ اگر میں ان سب کو ایک امام پر جمع کر دوں تو یہ بہت اچھی بات ہوگی۔ پھر مشورہ کر کے آپ نے ابی بن کعب کو ان کا امام بنا دیا۔ دوسری رات کو دوبارہ جب میں حضرت عمر کے ساتھ (مسجد کی طرف) نکلا تو لوگ اپنے امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت عمر نے (یہ دیکھ کر) کہا: کیسی اچھی ہے یہ بدعت (نِعْمَ الْبِدْعَةُ هَذِهِ)۔ صحیح البخاری، حدیث نمبر 2010۔

بدعت اسلام میں بری چیز ہے، جب کہ حضرت عمر نے یہاں اس کو اچھا بتایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں بدعت کے لفظ سے اصطلاحی بدعت مراد نہیں ہے۔ یہاں یہ اپنے لفظی معنی میں ہے، نہ کہ شرعی اصطلاح کے معنی میں۔

یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بات کو سمجھنے کے لیے تفصیلی اور جامع علم بہت ضروری ہوتا ہے۔ جس شخص نے صرف مساجد کے وعظ میں ”بدعت“ کا لفظ سنا ہو وہ اس حدیث کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکتا۔ اس حدیث میں ”بدعت“ کا مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس کے اصطلاحی مفہوم کے ساتھ اس کے لفظی مفہوم کو بھی جانتا ہو۔ صرف ایک مفہوم کو جاننا حدیث کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں۔ یہی اصول زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی چسپاں ہوتا ہے۔

بعض حدیثیں نقد داخلی ہی کے معیار پر غیر معتبر ثابت ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: وَفَضْلُ شَهْرِ شَعْبَانَ عَلَى الشُّهُورِ كَفَضْلِي عَلَى سَائِرِ الْأَنْبِيَاءِ (المقاصد الحسنہ، حدیث نمبر 740)۔ یعنی شعبان کے مہینہ کو دوسرے مہینوں پر ویسی ہی فضیلت ہے جیسی فضیلت مجھ کو دوسرے انبیاء پر۔

مہینوں میں سے کوئی مہینہ اگر افضل ہو تو یہ افضلیت سب سے پہلے رمضان کے مہینہ کو حاصل ہوگی۔ کیوں کہ قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن رمضان کے مہینہ میں اترا، اور جس مہینہ میں قرآن اترا اس میں ایک رات ایسی ہے جو ہزار راتوں سے بہتر ہے۔ ایسی حالت میں کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ کوئی مہینہ رمضان سے بھی زیادہ افضل ہوگا۔

29 اکتوبر 1985

ایک حدیثِ رسول ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: وَلَا يَزَالُ أَحَدُكُمْ فِي صَلَاةٍ مَا انْتَهَرَ الصَّلَاةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 647)۔ یعنی ایک شخص اس وقت تک برابر نماز میں رہتا ہے جب تک وہ (مسجد میں) نماز کا منتظر رہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف مسجد میں موجود رہنا ہی ثواب کا باعث بن جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص نفسیات نماز کے ساتھ نماز کے انتظار میں ہو اس کا یہ وقت بھی نماز میں شمار ہو جاتا ہے اور اس کو وہی ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے والے کو ملتا ہے۔

اس طرح کی حدیثوں کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ کسی پتھر کے مجسمہ یا ربوٹ کے بارے میں نہیں ہیں، بلکہ زندہ انسان کے بارے میں ہیں۔ انسان سوچتا ہے۔ وہ صاحبِ نفسیات مخلوق ہے۔ ایسا انسان جب نماز کے انتظار میں بیٹھا ہو تو اس کا بیٹھنا سادہ قسم کا بیٹھنا نہیں ہوتا۔ وہ اگر سچا نمازی ہے تو نماز کے انتظار کے وقت بھی نماز کے بارے میں سوچے گا۔ اس وقت بھی اس کا دل خدا میں لگا رہے گا۔ یہی وہ کیفیت ہے، جو اس کے انتظار نماز کے لمحات کو بھی ادائیگی نماز کے لمحات میں شامل کر دیتی ہے۔

30 اکتوبر 1985

عکرمہ نے روایت کیا کہ عبداللہ بن عباس نے قرآن کی سورہ الحدید آیت 23 کے تحت کہا: لَيْسَ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا وَهُوَ يَحْزَنُ وَيَفْرَحُ، وَلَكِنَّ الْمُؤْمِنَ يَجْعَلُ مُصِيبَتَهُ صَبْرًا، وَغَنِيمَتَهُ شُكْرًا (تفسیر القرطبی، جلد 17، صفحہ 258)۔ یعنی کوئی ایسا شخص نہیں جو غم گین نہ ہوتا ہو اور خوش نہ ہوتا ہو۔ مگر مومن اپنی مصیبت کو صبر بنا لیتا ہے، اور اپنے فائدہ کو شکر بنا لیتا ہے۔

گائے کے اندر گھاس داخل ہوتی ہے تو اس کا اندرونی نظام اس کو دودھ میں تبدیل کر دیتا ہے اور گھاس اس کے اندر سے دودھ بن کر نکلتی ہے۔ اسی طرح مومن کے اندر ایک خصوصی نفسیاتی نظام ہوتا ہے۔ یہ نظام مصیبت کو خدا کے لیے صبر میں بدل دیتا ہے اور راحت کو خدا کے لیے شکر میں۔ اس طرح دونوں حالتیں اس کے حق میں نعمت بن جاتی ہیں۔ اس روایت میں "يَجْعَلُ" کا لفظ بہت بامعنی ہے، یعنی وہ اپنے غم کو منفی راستے پر لگانے کے بجائے صبر میں کنورٹ کرتا ہے۔

31 اکتوبر 1985

قرآن میں آیا ہے: **فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللَّهِ وَكَذَّبَ بِالْحَقِّ إِذْ جَاءَهُ الْبَيِّنَاتُ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكَافِرِينَ. وَالَّذِي جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ. لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذَلِكَ جَزَاءُ الْمُحْسِنِينَ (34-32:39)**۔ یعنی پھر اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولا اور اس نے سچی بات کو جھٹلایا جب کہ وہ اس کے پاس آئی۔ کیا منکروں کا ٹھکانا دوزخ میں نہیں۔ اور جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کو سچ مانا وہی لوگ ڈرنے والے ہیں۔ ان کے لیے وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہ بدلا ہے نیکی کرنے والوں کا۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کا اعتراف کرنا سب سے بڑی نیکی ہے، اور سچائی کا انکار کرنا سب سے بڑا جرم۔ سچائی کا ظہور گویا خود خدا کا ظہور ہے۔ اس لیے سچائی کو نظر انداز کرنا خدا کو نظر انداز کرنا ہے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن بالکل ذلیل و خوار ہو کر رہ جائیں گے۔

جن لوگوں کے دلوں میں تقویٰ (کھٹک) ہو، ان کے سامنے جب سچائی آتی ہے تو وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرتے ہیں۔ ان کا سنجیدہ غور و فکر انہیں یہاں تک پہنچاتا ہے کہ وہ سچائی کو پالیں اور اس کا اعتراف کر کے اس کے ساتھی بن جائیں۔

17 اگست 1985

آدمی اپنے بیٹے کی کامیابی پر حسد نہیں کرتا۔ مگر دوسرا کوئی شخص کامیاب ہو تو اس کو دیکھ کر وہ حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیٹے کی کامیابی کو وہ اپنی کامیابی سمجھتا ہے، اور دوسرے

شخص کی کامیابی کو غیر کی کامیابی۔

8 اگست 1985

اولیور وینڈل ہومز (Oliver Wendell Holmes, 1809-1894) نے کہا ہے کہ  
نوجوان شخص عموم کو دیکھتا ہے، اور عمر رسیدہ شخص استثنا کو:

The young man knows the rules, but the old man  
knows the exceptions.

زندگی کا سفر ہمیشہ ہموار نہیں ہوتا۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی اتفاقی رکاوٹ سامنے  
آ کر ہمارے سوچے ہوئے نقشہ کو بگاڑ دیتی ہے۔ اس لیے عقل مند وہ ہے جو صرف عام حالات پر  
بھروسہ نہ کرے، بلکہ غیر متوقع امکانات کو ذہن میں رکھ کر اپنا منصوبہ بنائے۔

9 اگست 1985

آئرش شاعر آسکر وائلڈ (Oscar Wilde, 1854-1900) نے کہا ہے کہ انسان ایک  
عقل مند جانور ہے جو ہمیشہ اس وقت برہم ہو جاتا ہے جب کہ اس کو عقل کے مطابق عمل کرنے کے  
لیے کہا جائے:

Man is a rational animal who always loses his temper when he  
is called upon to act in accordance with dictates of reason.

کیسا عجیب ہے یہ تضاد جو انسان کی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ ہر انسان کا یہ حال ہے کہ  
دوسروں کے خلاف عقل کو استعمال کرنے میں وہ نہایت ہوشیار ہے، لیکن اگر خود اپنے خلاف عقل کو  
استعمال کرنا ہو تو وہ ایسا بن جائے گا، جیسے کہ اس کے پاس عقل ہی نہیں، جو کسی بات کو سمجھے، اور کسی  
معاملہ کی گہرائی تک اتر سکے۔

10 اگست 1985

آدمی دوسروں کے بیٹے کے بارے میں حسد کے ذہن سے سوچتا ہے، اور خود اپنے بیٹے کے  
بارے میں خیر خواہی کے ذہن سے۔ ایک شخص کی زندگی برباد ہو گئی ہو تو دوسروں کے بارے میں وہ

چاہتا ہے کہ جس طرح میں برباد ہوا ہوں وہ بھی برباد ہو جائیں۔ مگر خود اپنی اولاد کے بارے میں اس کا ذہن اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اپنی اولاد کے بارے میں وہ سوچتا ہے — اگرچہ میری زندگی برباد ہوگئی مگر میری اولاد کی زندگی برباد نہ ہونے پائے۔

12 اگست 1985

بے آمیز حق اس دنیا میں سب سے زیادہ اجنبی چیز ہے۔ ہر دوسری چیز کے گرد انسانوں کی بھیڑ جمع ہو سکتی ہے۔ مگر بے آمیز حق کے گرد چند انسانوں کو اکھٹا کرنا بھی انتہائی حد تک دشوار ہے۔ پیغمبروں کی تاریخ اس کا زندہ ثبوت ہے۔ پیغمبر آخر الزماں کو چھوڑ کر تمام معلوم پیغمبروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو صرف ایسے ہی کچھ افراد مل سکے جو خونی رشتہ کی بنا پر ان سے نفسیاتی تعلق رکھتے تھے۔ خونی رشتہ سے باہر کوئی شخص انہیں ملا جو حقیقی معنوں میں ان کا ساتھی بن سکے۔

حضرت ابراہیم کا ساتھ دینے والے صرف ان کے بھتیجے حضرت لوط اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل تھے۔ حضرت لوط کا ساتھ آخر وقت میں صرف ان کی بیٹیوں نے دیا۔ حضرت موسیٰ کے سچے ساتھی صرف حضرت ہارون ثابت ہوئے جو ان کے بھائی تھے۔ حضرت مسیح کو ان کی ماں کے سوا کوئی دوسرا نہ مل سکا۔ دوسرے لوگ جو ملے تھے وہ سب آخر وقت میں انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے، وغیرہ۔

پیغمبروں کی تاریخ میں اس اعتبار سے صرف پیغمبر آخر الزماں کا استثنا (exception) ہے۔ ان کو غیر رشتہ داروں میں بھی ایسے ساتھی ملے، جو واقعی ساتھی تھے۔ جو ساتھ چھوڑنے کے تمام ممکن واقعات پیش آنے کے باوجود آخر وقت تک ان کے ساتھی بنے رہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ براہ راست خدا کے تصرف کے تحت ہوا۔

ہمارے سیرت نگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ بیان کرتے ہیں کہ درخت اور پتھر ان کے ساتھ چلنے لگے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ انسان آپ کے ساتھ چلنے لگے تھے، اور یہ معجزہ براہ راست خدائی نصرت کے تحت پیش آیا جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: **وَلَا كُنَّ إِلَٰهَ حَبَّبَ إِلَيْكُمُ الْإِيمَانَ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَتْ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ (7: 49)**۔ یعنی



اور لیکن اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے دلوں میں مرغوب بنا دیا، اور کفر اور فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرانہ سچائی ہمیشہ مجرد سچائی ہوتی ہے۔ تاریخ سے کٹ کر اور ماحول سے اٹھ کر ہی آدمی پیغمبرانہ سچائی کو پہچان سکتا ہے، اور بد قسمتی سے ایسے لوگ معلوم انسانی تاریخ کے مطابق شاید پیدا ہی نہیں ہوئے۔

13 اگست 1985

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ اگر وہ درست ہو تو پورا جسم درست رہتا ہے۔ اور اگر اس میں بگاڑ آجائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ قلب ہے (أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)۔ صحیح البخاری، حدیث نمبر 52۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی اصلاح کا دار و مدار ”قلب“ کی اصلاح پر ہے۔ یہاں قلب کا لفظ عقل کے معنی میں ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہر قسم کی تبدیلیوں کا راز اندرونی تبدیلی میں ہے، یعنی سوچ و فکر کی تبدیلی، نہ کہ بیرونی تبدیلی۔

اس حدیث کی روشنی میں موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی تمام بڑی بڑی تحریکیں غیر فطری قرار پاتی ہیں۔ کیوں کہ ان تحریکوں کا نشانہ دوسری دوسری چیزوں کی تبدیلیاں تھی، نہ اندرونی تبدیلی۔ کسی کا نشانہ تبدیلی حکومت تھا، اور کسی کا نشانہ تبدیلی جغرافیہ، کسی کا نشانہ تبدیلی قیادت تھا، اور کسی کا نشانہ تبدیلی قانون۔ موجودہ زمانہ کی وہ تمام ہنگامہ خیز تحریکیں جن پر مسلمان فخر کرتے ہیں، وہ سب اسی قسم کی خارجی تبدیلیوں کا نعرہ لے کر اٹھیں۔ ان میں سے کوئی تحریک ایسی نہیں جو تبدیلی قلب (یا تبدیلی انسان) کے منصوبہ کے تحت اٹھائی گئی ہو۔

خارجی تبدیلی کو نشانہ بنا کر جو انقلاب لایا جائے اس کا انجام ہمیشہ صرف ایک ہوتا ہے — ایک برائی کو ہٹا کر دوسری شدید تر برائی لے آنا۔ کسی شخص نے نہایت صحیح کہا ہے:

A revolution is a successful effort to replace  
a bad government with a worse one.

انقلاب اس بات کی ایک کامیاب کوشش ہے کہ ایک بری حکومت سے چھٹکارا پا کر اس  
سے زیادہ بری حکومت قائم کی جائے۔

14 اگست 1985

شاہ ولی اللہ اور ان کے پیروؤں نے کہا کہ سکھ اور مرہٹہ سے اسلام کو خطرہ ہے۔ سکھ اور مرہٹہ  
راستہ سے ہٹا دئے گئے۔ مگر اسلام بدستور خطرہ میں باقی رہا۔ شاہ عبدالعزیز اور ان کے پیروؤں نے  
کہا کہ انگریزوں سے اسلام کو خطرہ ہے۔ انگریزوں کا اقتدار ختم ہو گیا مگر اسلام کا جو مسئلہ تھا وہ حل نہ ہوا۔  
محمد علی جناح اور دوسرے مسلم لیڈروں نے کہا کہ ہندو فرقہ سے اسلام کو خطرہ ہے۔ ہندو  
سے کٹ کر مسلمانوں کی علیحدہ ریاست قائم ہو گئی۔ مگر اس کے باوجود اسلام مسائل سے گھرا رہا۔  
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ہم خیال لوگوں نے کہا کہ ایوب اور بھٹو سے اسلام کو خطرہ  
ہے۔ ایوب اور بھٹو کا اقتدار ختم ہو گیا مگر اسلام کا خطرہ ختم نہیں ہوا۔ مولانا علی میاں اور ان کے ماننے  
والوں نے کہا کہ سپریم کورٹ کے شاہ بانو کیس کے فیصلہ سے اسلام کو خطرہ ہے۔ پارلیمنٹ نے  
مسلمانوں کو سپریم کورٹ کے فیصلہ سے آزاد کر دیا۔ مگر اسلام بدستور خطرہ میں گھرا رہا۔  
یہ مسلمانان ہند کی تقریباً چار سو سال کی تاریخ کا خلاصہ ہے۔ ہر وہ طاقت جس کو مسلمانوں نے  
اسلام کا دشمن قرار دیا وہ راستے سے ہٹائی جاتی رہی۔ مگر اسلام اور مسلمان بدستور خطرات میں گھرے  
رہے۔ ہندستان میں بھی، پاکستان میں بھی اور بنگلہ دیش میں بھی۔ یہ طویل تجربہ یہ بتانے کے لیے کافی  
تھا کہ مسلم قائدین کی نشان دہی غلط تھی۔ مگر مسلمانوں کی بے شعوری کا یہ حال ہے کہ ہر اگلا قائد پچھلے  
قائدین کا صرف مقلد بنا ہوا ہے۔ ماضی کی نادانیوں نے مسلمانوں کو کوئی سبق نہیں دیا۔

15 اگست 1985

کہا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے ایک بار امام شافعی سے پوچھا — خدا کی کتاب کے

بارے میں آپ کا علم کیا ہے (ما علمك بكتاب الله)۔ امام شافعی نے جواب دیا کہ علوم قرآن کی بہت سی قسمیں ہیں۔ آپ کی مراد کس علم سے ہے۔ کیا امثال و اخبار سے، محکمات سے، تشابہات سے، تقدیم و تاخیر سے، ناسخ و منسوخ سے، باعتبار مکان کی ومدنی سے یا باعتبار زمان لیلی و نہاری (رات یا دن) سے، صیغی و شتائی (گرمی یا سردی) سے، باعتبار قیام اور سفر و حضر سے، اس کے اعراب اور حروف و الفاظ سے۔ اس طرح امام شافعی نے قرآن کے 73 علوم گنادیے۔

بارون رشید نے یہ سن کر کہا کہ آپ نے قرآن کے بہت کافی علوم کو جمع کر لیا ہے (لقد أوعيت من القرآن علماً عظيماً)۔ مرآة الجنان وعبرة اليقظان للشافعي، جلد 2، صفحہ 17

بظاہر یہ بڑے کمال کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ صحابہ کرام قرآن کے ان ”73 علوم“ سے واقف نہ تھے تو یہ مہارت اسلام کے بجائے محض ایک فن نظر آنے لگتی ہے۔ کیوں کہ اسلام اگر ان علوم کا نام ہوتا تو صحابہ کرام ضرور ان علوم کے ماہر ہوتے۔

16 اگست 1985

امریکن رائٹر رالف والڈو ایمرسن (Ralph Waldo Emerson, 1803-1882) نے

لکھا ہے کہ تم ایک اچھا چوہے دان بناؤ اور دنیا خود ہی چل کر تمہارے دروازے پر آجائے گی:

Build a better mousetrap and the world  
would beat a path to your door.

لوگوں کے نزدیک سب سے زیادہ اہم چیز معیار (quality) ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ جو چیز وہ بازار سے خریدے وہ اعلیٰ معیار کی ہو۔ استعمال کے وقت ہر اعتبار سے وہ بہترین ثابت ہو۔

لوگوں کا یہ مزاج ہی کسی آدمی کے لیے موجودہ دنیا میں ترقی کا سب سے بڑا زینہ ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کو دنیا میں عزت اور ترقی کا مقام حاصل ہو اس کو صرف ایک کام کرنا چاہیے۔ وہ جو کام بھی کرے اعلیٰ معیار پر کرے اس کے بعد دنیا خود اسے اس کا مطلوبہ مقام دینے پر مجبور ہو جائے گی۔

دہلی میں اس اصول کی ایک زندہ مثال خلیق احمد ٹونکی (پیدائش 1932) ہیں۔ انھوں نے

کتابت کے کام میں ایک طویل عمر صرف کر دی۔ یہاں تک کہ وہ دہلی کے سب سے اچھے کاتب بن گئے۔ اب یہ حال ہے کہ انھیں کام تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے کاتبوں کے مقابلہ میں وہ چوگنا اجرت لیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ حال ہے کہ ان کے یہاں کام کرنے والوں کی بھیر لگی رہتی ہے۔ انھیں کام کی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑتا۔ کام خود ان کو تلاش کر کے ان کے گھر پہنچ جاتا ہے۔

میں نے اپنے تجربہ میں یہ پایا ہے کہ خلیق ٹونکی صاحب انتہائی معیار پسند آدمی ہیں۔ وہ جو بھی لکھتے ہیں اس کو آخری حد تک بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواہ کوئی بڑا کام ہو یا چھوٹا کام۔ کم پیسہ والا ہو یا زیادہ پیسہ والا۔ اپنے اس ذوق کی وجہ سے ماضی میں انھوں نے بہت نقصان اٹھایا ہے مگر انھیں نقصانات کی وجہ سے انھیں یہ موقع ملا کہ وہ ہندستان کے نمبر ایک کاتب بن گئے۔

117 اگست 1985

کتابیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو فخر کی نفسیات کو تسکین دیں۔ دوسری وہ جو نصیحت کے جذبات کو ابھاریں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بے شمار کتابیں لکھی اور چھاپی ہیں۔ مگر یہ کتابیں زیادہ تر پہلے خانہ میں جاتی ہیں۔ وہ کسی نہ کسی اعتبار سے مسلمانوں کے فخر کے جذبات کو تسکین دیتی ہیں۔ ان سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ آدمی کے اندر نصیحت کی فکر ابھرے، اس کے دل میں خود احتسابی کا جذبہ بیدار ہو۔

موجودہ زمانہ میں لکھی جانے والی کتابوں کو جب ایک مسلمان پڑھتا ہے تو کوئی کتاب اس کے ذہن میں سیاسی قصیدہ بن جاتی ہے اور کوئی کتاب فضائلی قصیدہ۔ اس قسم کی باتیں آدمی کے اندر پرفخراہتزاز تو ضرور پیدا کرتی ہیں اور بعض اوقات ان کے زیر اثر وہ بعض ظاہری عمل بھی کرنے لگتا ہے مگر اس کی کوئی گہری بنیاد نہیں ہوتی۔ ایسے قصائد اس کے دل کو نہیں تڑپاتے، وہ اس کے طرز فکر کو نہیں بدلتے، وہ اس کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کرتے۔

119 اگست 1985

کچھ عباسی خلفا، معتزلی متکلمین کے اثر سے، قرآن کو مخلوق کہتے تھے۔ چنانچہ جو لوگ قرآن کو

غیر مخلوق کہتے ان کو انھوں نے سخت سزائیں دیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل (241-164ھ) وغیرہ۔ اس فتنہ کو ختم کرنے میں جن اسباب کا دخل ہے، ان میں بعض لطائف بھی شمار کیے جاسکتے ہیں۔ یہ فتنہ خلیفہ واثق کے زمانہ میں ختم ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ خلیفہ واثق عباسی کے زمانہ میں ایک ظریف شخص تھا۔ وہ دربار میں لوگوں کو ہنسایا کرتا تھا۔ ایک روز مذکورہ ظریف دربار میں آیا اور سلام کے بعد سنجیدگی کے ساتھ کہا— اے امیر المؤمنین، قرآن کی موت پر اللہ آپ کو بڑا اجر دے (یا امیر المؤمنین، أعظم الله أجرك في القرآن)۔

خلیفہ نے حیران ہو کر کہا کہ تمہارا برا ہو، قرآن پر بھی کہیں موت آتی ہے (ویلک، القرآن یموت)۔ ظریف نے دوبارہ سادگی کے ساتھ جواب دیا کہ اے امیر المؤمنین ہر مخلوق مرے گی (یا امیر المؤمنین، کل مخلوق یموت)۔

اس کے بعد ظریف نے مزید کہا کہ مجھے بڑی فکر اس بات کی ہے کہ قرآن کی موت پر مسلمانوں کی تراویح کا کیا ہوگا۔ خلیفہ واثق اس کو سن کر بے اختیار ہنس پڑا۔ اس نے کہا کہ ٹھہر، خدا تجھے ہلاک کرے (قاتلك الله، أمسك) الطبقات السنیة فی تراجم الحنفیة، صفحہ 90۔

تاہم یہ لطیفہ خلیفہ واثق پر بہت اثر انداز ہوا۔ وہ سابق خلفا کی طرح اس معاملہ میں زیادہ شدید نہ تھا۔ اب اس کا باقی ماندہ جوش بھی ختم ہو گیا اور خلیفہ کے ٹھنڈا پڑنے سے سارے ملک میں یہ مسئلہ ختم ہو گیا۔ کبھی ایک لطیفہ سے وہ کام ہو جاتا ہے، جو دلائل سے نہ ہو سکا تھا۔

120 اگست 1985

دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ ہے، وہ ہے دوسرے کے خلاف سوچنا، اور دنیا میں جو چیز سب سے کم ہے، وہ ہے اپنے خلاف سوچنا۔ دوسرے کے خلاف رائے زنی کرنے کے لیے ہر آدمی ذہانت کی چوٹی پر نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس الفاظ کا اتنا بڑا بھنڈا ہے جو کبھی ختم نہ ہو۔ مگر جب معاملہ اپنے خلاف سوچنے کا ہو تو وہی آدمی ایسا بن جاتا ہے جیسے کہ اس کے اندر کسی بات کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ جو بات اپنے خلاف ہو، جس میں خود اپنی شخصیت زد میں آ رہی ہو،

اس کو خواہ کتنا ہی طاقت و ردلائل کے ساتھ پیش کیا جائے آدمی اس کو سمجھ نہیں پاتا، اور نہ اس کو ماننے کے لیے تیار ہوتا ہے۔

21 اگست 1985

چند آدمیوں سے اس موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دین کی حقیقت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ دین کی اصل حقیقت اپنے آپ کو خدا کے آگے سرنڈر کرنا ہے۔ یہی دین کا اول بھی ہے اور یہی دین کا آخر بھی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے جس کا سب سے زیادہ طاقت و رجز بہ انا (ego) کا جذبہ ہے۔ انسان کی انا اپنی نوعیت کے اعتبار سے خدائی انا کی ہم سطح ہے۔ مگر دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان کو کسی بھی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ انسان، بلا تشبیہ، ایک خدا ہے۔ مگر وہ ایک ایسا خدا ہے، جو ذاتی اختیار سے مکمل طور پر محروم ہو۔ اس کے تمام اختیارات خدا کی طرف سے عطیہ ہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آدمی کا امتحان ہو رہا ہے۔ گویا کہ مجازی خدا کو حقیقی خدا کا اعتراف کرنا ہے۔ یہ بلاشبہ مشکل ترین کام ہے مگر اسی مشکل ترین کام میں انسان کی نجات کا راز چھپا ہوا ہے۔ موجودہ دنیا میں خدا خود سامنے نہیں آتا۔ اس لیے مذکورہ اعتراف براہ راست خدا کے سامنے نہیں ہوتا، یہ اعتراف عملاً ایک انسان کے سامنے ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی انسان دلیل حق کے ساتھ کھڑا ہو تو انسان (یا اس دلیل حق) کی حیثیت مخاطبین کے لیے خدا کے نمائندہ کی حیثیت ہو جاتی ہے۔ اس وقت جو شخص جھک گیا، وہ خدا کے سامنے جھکا۔ اس وقت جو شخص نہیں جھکا، اس نے خدا کے سامنے جھکنے سے انکار کیا۔

22 اگست 1985

عربی کا ایک مقولہ ہے: إِذَا تَكَلَّمْتُ بِالْكَلِمَةِ مَلَكَتْنِي وَإِذَا لَمْ أَتَكَلَّمْ بِهَا مَلَكَتْهَا (الدر الفرید و بیت القصید للمستعصمی، جلد 6، صفحہ 65)۔ یعنی جب میں نے ایک بات کہہ دی تو وہ میرے اوپر اختیار حاصل کر لیتی ہے اور اگر میں بات نہ کہوں تو میں اس کے اوپر اختیار رکھتا ہوں۔

شیخ سعدی نے یہی بات کسی قدر مختلف انداز میں اس طرح کہی ہے:

تامر دسختن نہ گفتہ باشد، عیب و ہنرش نہفتہ باشد

آدمی جب تک بات نہ کہے تو اس کا عیب و ہنر چھپا رہتا ہے

اسی بات کو انگریزی میں کسی نے اس طرح کہا ہے کہ ہم اپنے نہ کہے ہوئے الفاظ کے آقا

ہیں، اور ہم ان الفاظ کے غلام ہیں جو ہم اپنی زبان سے کہہ دیں:

We are masters of our unsaid words.

And slaves to those we let slip out.

مختلف زبانوں میں اس طرح کے مشابہ اقوال اس بات کا ایک مظاہرہ ہیں کہ تمام انسان

حقیقۃً ایک ڈھنگ پر سوچتے ہیں۔ تمام حقیقتیں آفاقی حقیقتیں ہیں۔ فطرت کی سطح پر سب کا انداز فکر

ایک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ کوئی شخص اس کو ایک زبان میں بیان کرتا ہے اور کوئی شخص دوسری

زبان میں۔

23 اگست 1985

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ایک دعا عربی ماہ نامہ العربی میں پڑھی۔ وہ دعا یہ ہے: اللّٰهُمَّ

إِنِّي أَطَعْتُكَ فِي أَحَبِّ الْأَشْيَاءِ إِلَيْكَ، وَهُوَ التَّوْحِيدُ، وَلَمْ أَغْصِكَ فِي أَبْغَضِ الْأَشْيَاءِ

إِلَيْكَ وَهُوَ الْكُفْرُ، فَاعْفُرْ لِي مَا بَيْنَهُمَا (الآخبار الموقفاة للزبير بن بكار، صفحہ 198)۔ یعنی

خدا یا، میں نے تیری سب سے زیادہ محبوب چیز میں تیری اطاعت کی ہے، اور وہ توحید ہے۔ اور تیری

سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز میں تیری نافرمانی نہیں کی اور وہ کفر ہے۔ پس ان دونوں کے درمیان جو

کچھ ہے اس میں تو مجھ کو بخش دے۔

24 اگست 1985

”اقبال کی نظری و عملی شعریت“ ایک مختصر کتاب ہے جس کے مصنف پروفیسر مسعود حسین

خاں (پیدائش 1919) ہیں۔ انھوں نے یہ کتاب سری نگر (کشمیر) میں اپنے قیام کے دوران مرتب

کی ہے، اور مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے اس کو شائع کیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں ایک دیباچہ ”حرفے چند“ کے عنوان سے ہے۔ اس میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں:

”ڈل جھیل کے کنارے نسیم باغ کے چناروں کے سایہ تلے مجھے خدا نہیں تو کم  
از کم اقبال کو بے نقاب دیکھنے کا موقع ملا“۔

یہ بات جو ایک ادیب نے بے تکلف لکھ دی، یہی ہمارے علما تک کا حال ہے۔ قدرت کی نشانیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو اس لیے ہیں تاکہ ان کو دیکھ کر خدا کے بندے خدا کو پائیں۔ مگر نشانوں کے ہجوم میں بھی کسی کو خدا دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ ”اقبال“ کو ہر شخص دیکھ لیتا ہے۔ خدا کی ذات کسی کو نظر نہیں آتی۔ مگر انسانی شخصیتیں لوگوں کو خوب نظر آتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہر مجلس اور ہر اجتماع میں انسانی شخصیتوں کے چرچے ہیں۔ مگر اُس مجلس اور اس اجتماع سے خدا کی زمین خالی ہے، جہاں واقعی معنوں میں خدا کی یاد کی جائے۔ جہاں لوگ اسی طرح خدا کے کمالات سے سرشار ہو کر خدا کا تذکرہ کریں، جس طرح وہ انسانوں کے کمالات سے سرشار ہو کر ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔

126 اگست 1985

بہت سے لوگوں سے میں نے پوچھا کہ آپ کی زندگی کی خاص دریافت کیا ہے۔ یہ سوال میں نے زیادہ تر ان لوگوں سے پوچھے جو صاحب علم تھے اور جنہوں نے زندگی کا لمبا تجربہ اٹھایا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ اکثر لوگوں نے میرے سوال کا جواب اس انداز میں دیا جیسے کہ ان کی کوئی دریافت ہی نہ ہو، جیسے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں کوئی نئی چیز پائی ہی نہ ہو۔

اس کا سبب کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر لوگ روایتی طریقے میں جیتے ہیں۔ جو کچھ دوسرے لوگ کر رہے ہیں، وہی وہ بھی کرنے لگتے ہیں، اور اگر کوئی شخص دوسرے کے مقابلہ میں اپنا راستہ بدلتا ہے تو محض ظاہری اور جزئی معنوں میں۔ ایسی حالت میں لوگوں کو کوئی نئی دریافت کیوں کر ہو سکتی ہے۔



اسلامی اصطلاح میں ہجرت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک، داخلی ہجرت (المہجرة الداخلية) دوسری، خارجی ہجرت (المہجرة الخارجية)۔ داخلی ہجرت بڑی ہجرت (المہجرة الكبرى) ہے، اور خارجی ہجرت چھوٹی ہجرت (المہجرة الصغرى) ہے۔

داخلی ہجرت کو مختلف احادیث رسول سے سمجھا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: **المُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ** (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6484)۔ یعنی مہاجر وہ ہے، جو اس کو چھوڑ دے جس سے خدا نے منع کیا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ سے ایک بار پوچھا گیا: **أَيُّ الْمُهَاجِرَةِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: أَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ عَزَّ وَجَلَّ**۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 19435)۔ یعنی سب سے افضل ہجرت کون سی ہے؟ آپ نے جواب دیا: یہ کہ تم اس چیز کو چھوڑ دو جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے۔

یہی معاملہ جہاد کا بھی ہے۔ داخلی ہجرت اور داخلی جہاد کو ایک حدیث رسول میں ان الفاظ بیان کیا گیا ہے: **وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوبَ، وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ** (مسند احمد، حدیث نمبر 23967)۔ یعنی مہاجر وہ ہے جو غلطیوں اور گناہوں کو ترک کر دے، اور مجاہد وہ ہے جو اللہ کی فرماں برداری میں اپنے نفس سے لڑے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف مواقع پر داخلی جہاد کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ ان میں سے بعض روایات درج ذیل ہیں:

**الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ** (جامع الترمذی، حدیث نمبر 1621)۔ یعنی مجاہد وہ ہے، جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔

**الْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ لِلَّهِ** (مسند احمد، حدیث نمبر 23951)۔ یعنی مجاہد وہ ہے، جو اللہ کے لیے اپنے نفس سے جہاد کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس آئے۔ یہ ایک مہم تھی جس میں کوئی جنگ

پیش نہیں آئی۔ واپسی کے بعد آپ نے فرمایا کہ ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہیں۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: قَدِمْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْأَصْغَرِ إِلَى الْجِهَادِ الْأَكْبَرِ . قَالُوا: وَمَا الْجِهَادُ الْأَكْبَرُ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ قَالَ: مُجَاهَدَةُ الْعَبْدِ هَوَاهُ (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، جلد 13، صفحہ 498۔ ایبہ تہمی، الزہد الکبیر، حدیث نمبر 373)۔ تم لوگ چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آئے ہو۔ لوگوں نے کہا: جہاد اکبر کیا ہے، اے خدا کے رسول، آپ نے کہا: بندے کا اپنے نفس سے جہاد کرنا۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ہر آدمی ”چھوٹی ہجرت“ اور ”چھوٹے جہاد“ کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے۔ مگر بڑی ہجرت اور بڑے جہاد کی کسی کو خبر نہیں۔

28 اگست 1985

سائنس کی تاریخ میں اکثر بڑی دریافتیں اتفاق (chance) کے ذریعے پیش آئی ہیں۔ چنانچہ سائنس دانوں نے اس کے لیے ایک خاص لفظ وضع کیا ہے، جس کو سرینڈیٹیٹی (serendipity) کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ سرندیپ کی ایک کہانی سے لیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ سائنسی دریافتوں کو خوش گوار واقعات (happy accidents) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اکسرے (X-rays) کی دریافت اتفاقی طور پر ہوئی۔

تاہم یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اتفاق بذات خود دریافت تک پہنچاتا ہے۔ ہندستانی سائنس داں سی وی رمن (Chandrasekhara Venkata Raman, 1888-1970) نے صحیح کہا — ایسا اتفاق صرف سائنس داں کو پیش آتا ہے۔ یعنی ایک شخص جو باتوں کو جانتا ہو اور وہ تحقیق میں لگا ہوا ہو، وہی بوقت اتفاق کسی بات کو پکڑ سکتا ہے۔ اسی بات کو پاستر (Louis Pasteur, 1822-1895) نے ان الفاظ میں کہا تھا — مشاہدات کے میدان میں اتفاق صرف تیار ذہن کے لیے کارآمد ہوتا ہے:

In the field of observation, chance favours  
only the prepared mind.

اکسرے کا موجد رٹجن (Wilhelm Conrad Röntgen, 1845-1923) قرار

پایا۔ حالانکہ اس سے پہلے یہ کروکس (William Crookes, 1823-1919) کے مشاہدہ میں آئی تھی۔ مگر اس نے اس کو بے معنی (nonsense) قرار دے کر نظر انداز کر دیا، وغیرہ۔  
 نئی چیز دریافت کرنے کے لیے سب سے اہم چیزیں دو ہیں۔ ایک، تجسس (curiosity)، دوسرے یہ کہ آدمی وہ ضروری معلومات رکھتا ہو جس کے بعد وہ ایک چیز کو دوسری چیز سے وابستہ (link) کر سکے۔

129 اگست 1985

انگریز شاعر اور ڈراما نگار ٹامس شیڈول (Thomas Shadwell, 1642-1692) کا قول ہے کہ بے وقوف کی جلد بازی دنیا میں سب سے زیادہ سست رفتار چیز ہے:  
 The haste of a fool is the slowest thing in the world.

31 اگست 1985

آج کل کے لوگوں کے حالات کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نہیں جو یہ سوچ کر لکھے یا بولے کہ رضائے خداوندی کیا ہے۔ ہر ایک بس یہ سوچ کر لکھتا ہے اور بولتا ہے کہ رضائے قوم کیا ہے، رضائے مفاد کیا ہے، رضائے مصلحت کیا ہے، وغیرہ۔

31 اگست 1985

ایک مفکر کا قول نظر سے گزرا کہ ”جہاں تلوار چلتی ہے وہاں سے ہل غائب ہو جاتے ہیں۔“ یہ نہایت درست بات ہے۔ اور پوری تاریخ اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ جنگ اور تعمیر دونوں کام ساتھ ساتھ نہیں ہو سکتا۔ سچے قائد کی پہچان یہ ہے کہ وہ جنگ اور ٹکراؤ سے آخری حد تک اعراض کرے۔ تاکہ اس کا ”لوبا“ تلوار بننے میں ضائع نہ ہو، بلکہ وہ ہل بنانے کے کام میں آسکے۔

2 ستمبر 1985

ایک صاحب ایک مسلم قائد کی عظمت کے بہت زیادہ قائل تھے۔ انھوں نے قائد موصوف کے بارے میں تقریر کرتے ہوئے پر جوش طور پر کہا: وہ سو بار غلطی کر سکتے تھے مگر وہ ایک بار بھی کسی

کے ہاتھ بک نہیں سکتے تھے۔ میں نے کہا کہ ”سو بار“ غلطی کرنا خود بھی بکنے ہی کی ایک صورت ہے۔ یہ خود اپنے ہاتھ بکنا ہے، یہ اپنے نفس کے ہاتھ فروخت ہونا ہے۔

جب بھی آدمی کوئی غلط بات کہتا ہے یا کوئی غلط اقدام کرتا ہے تو بہت جلد مختلف طریقوں سے اس کی غلطی اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ اگر آدمی اپنے نفس کے ہاتھ بکا ہوا نہ ہو تو وہ اپنی غلطی کا اعلیٰ الاعلان اعتراف کرے گا۔ حتیٰ کہ اگر وہ قائد ہوتے ہوئے بار بار غلطی کیے چلا جا رہا ہے تو وہ اعلان کر دے گا کہ میں قیادت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میری فہم و بصیرت اس سے کم ہے کہ میں قوم کی قیادت کر سکوں۔ اس لیے میں قیادت کے کام سے مستعفی ہو رہا ہوں۔

کوئی شخص غلطی پر غلطی کرے اور پھر بھی قیادت کے میدان سے واپس نہ ہو تو یہ واضح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے اوپر اس کا نفس چھایا ہوا ہے۔ ساکھ اور عزت نفس کا سوال اس کو اعلیٰ الاعلان اپنی قیادت کی نااہلی کا اعتراف کرنے سے روکے ہوئے ہے۔ اس سے زیادہ بکا ہوا انسان اور کون ہو سکتا ہے، جو پر جوش الفاظ اور حقیقت واقعہ میں فرق نہ کر سکے۔

3 ستمبر 1985

غزوة طائف (8ھ) کی روایات میں سے ایک روایت ان الفاظ میں آئی ہے: ثُمَّ سَلَكَ فِي طَرِيقٍ يُقَالُ لَهَا الضِّيْقَةُ، فَلَمَّا تَوَجَّهَ فِيهَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَأَلَ عَنْ اسْمِهَا، فَقَالَ: مَا اسْمُ هَذِهِ الطَّرِيقِ؟ فَقِيلَ لَهُ الضِّيْقَةُ، فَقَالَ: بَلْ هِيَ الْيُسْرَى (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 482)۔ یعنی پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک راستے پر چلے جس کو ”تنگ“ کہا جاتا تھا۔ جب آپ اس راستے پر آئے تو آپ نے اس کے نام کے بارے میں پوچھا۔ آپ نے کہا کہ اس راستے کا نام کیا ہے۔ کہا گیا کہ ”تنگ“ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ یہ ”آسان“ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مومن کا مزاج مثبت مزاج ہونا چاہیے۔ مومن تاریکی میں روشنی کو دیکھتا ہے، وہ ڈس ایڈوائج میں ایڈوائج کو دریافت کرتا ہے۔ وہ مشکل کو آسانی کے روپ میں ڈھال دیتا ہے۔ جس چیز کو عام لوگ الضیقۃ کہتے ہیں وہ مومن کے ذہن میں آکر الیُسْرَى بن جاتی ہے۔ غالباً

یہی وہ چیز ہے، جس کو ٹائن بی نے برتر حل (superior solution) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

4 ستمبر 1985

ابوسعید خدریؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللَّهَ (جامع الترمذی، حدیث نمبر 1955)۔ یعنی جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ خدا کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا۔

احسان کیے جانے پر احسان مند ہونا اور محسن کا شکر ادا کرنا ایک مزاج اور قلبی کیفیت کی بات ہے۔ ایک شخص کے اندر یہ مزاج حقیقی معنوں میں پیدا ہو جائے تو وہ دونوں معاملات میں شکر ادا کرنے لگے گا۔ جو شخص بندوں کے سلوک پر ان کا شکر گزار ہو وہ خدا کی نعمتوں پر بھی ضرور اس کا شکر گزار ہوگا۔ اسی طرح جب ایک شخص خدا کی نعمتوں کا حقیقی معنوں میں شکر گزار ہو جائے تو بندوں کے سلوک پر بھی وہ ان کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

5 ستمبر 1985

ابن عمر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: مَنْ صَنَعَ إِلَيْكُمْ مَعْرُوفًا فَكَافِئُوهُ، فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا مَا تُكَافِئُونَهُ، فَادْعُوا لَهُ حَتَّى تَرَوْا أَنَّكُمْ قَدْ كَافَأْتُمُوهُ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 1672)۔ یعنی کوئی شخص تمہارے اوپر احسان کرے تو اس کا بدلہ دو۔ اور اگر تمہارے پاس بدلہ پورا کرنے والی کوئی چیز نہ ہو تو محسن کے لیے دعا کرو۔ اور اس وقت تک دعا کرتے رہو جب تک تم کو خیال ہو کہ تم نے بدلہ پورا کر دیا۔

بہترین انسان وہ ہے جو دوسروں کو دے۔ اگر اس کے پاس کوئی مادی چیز دینے کے لیے نہیں ہے تو وہ اس کے حق میں دعائے خیر کا ہدیہ پیش کرے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ سماج میں لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔ اور اگر لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے لیے دعا کرنے کا مزاج پیدا ہو جائے تو ایسے سماج میں یقیناً خیر خواہی کا جذبہ پرورش پائے گا۔ کیوں کہ کسی کے حق میں سچی دعا اس کے بغیر نہیں نکل سکتی کہ اس کے لیے دعا گو کے دل میں سچی خیر خواہی کی کیفیت موجود ہو۔

6 ستمبر 1985

ڈان پیٹ (Donn Piatt, 1819-1891) کا قول ہے کہ بڑا آدمی وہ ہے جو اپنے کام

کی انجام دہی کے لیے دوسروں کا دماغ استعمال کر سکے:

That man is great who can use the brain of  
others to carry out his work.

خود کرنا آسانی ہے مگر دوسروں سے کروانا بہت مشکل ہے۔ مگر صرف اپنے بل پر آدمی کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ بڑا کام کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ بہت سے دماغوں کو اس میں مصروف کیا جائے۔ مگر بہت سے دماغوں کو کسی ایک کام میں مصروف کرنے کے لیے زبردست حکمت اور ذہانت درکار ہے۔ جو آدمی اس حکمت اور ذہانت کا ثبوت دے سکے یقیناً وہ اس قابل ہے کہ اس کو بڑا آدمی کہا جائے۔

7 ستمبر 1985

مینڈک اگر ہانھی کو نگلنا چاہے تو ہانھی کا کچھ نہیں بگڑے گا، البتہ مینڈک کا پیٹ پھٹ جائے گا۔

9 ستمبر 1985

رچرڈ کوشنگ (Richard James Cushing, 1895-1970) کا قول ہے کہ مذہبی

شخصیتوں کے ساتھ جنت میں رہنا بہت عظیم ہے، مگر ان کے ساتھ زمین پر رہنا ایک مصیبت ہے:

It is great to live with saints in heaven,  
but it is hell to live with them on earth.

یہ دراصل مذہبی شخصیتوں پر طنز ہے۔ مذہبی لوگ وعظ کہتے ہیں کہ ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چلو تو تم کو موت کے بعد کی زندگی میں جنت ملے گی۔ مگر خود ان مذہبی شخصیتوں کا کردار اکثر نہایت برا ہوتا ہے۔ گویا کہ دنیا میں ان کے ساتھ رہنا جہنم میں رہنا ہے۔ جب کہ ان کے قول کے مطابق ان کے طریقے پر چلنا اگلی زندگی میں جنت میں داخل ہونا ہے۔ مذہبی شخصیتوں کے قول و عمل کا یہ تضاد اکثر مذاہب میں پایا جاتا ہے۔

10 ستمبر 1985

انگریزی رائٹر برنارڈ شا (George Bernard Shaw, 1856-1950) نے کہا کہ

ایک بے صلاحیت آدمی کے لیے مشہور ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ شہید ہو جائے:

Martyrdom is the only way in which a man can become famous without ability.

یہ قول، خاص طور پر موجودہ پریس کے دور میں نہایت درست ہے۔ آج کوئی شخص قوم یا

مذہب کے نام پر ایک احمقانہ اقدام کرتا ہے۔ اس کے بعد فوراً اس کا نام چھپنا شروع ہو جاتا ہے۔

وہ تیزی سے شہرت حاصل کر لیتا ہے۔ احمقانہ اقدام کر کے شہید ہونا قوم کو تو کچھ نہیں دیتا، البتہ وہ

شخص فوراً شہرت کا مقام پالیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس قسم کی شہرت حاصل کرنے والوں کی تعداد شاید سب سے زیادہ

مسلمانوں میں ہے۔ موجودہ زمانہ میں لاکھوں مسلمان ہیں جنہوں نے قوم یا مذہب کے نام پر شہید ہو

کر غیر معمولی شہرت پائی۔ حالاں کہ ان کی شہادت سے نہ مذہب کو کچھ ملا اور نہ قوم کو۔

دانش مند کی شہادت قوم کے لیے ترقی کا زینہ ہے۔ نادان کی شہادت صرف شہید کے لیے

ذاتی شہرت کا ذریعہ۔

11 ستمبر 1985

انسان کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز دریافت ہے۔ دریافت ہی سے دنیا کی ترقیاں بھی ملتی

ہیں اور دریافت ہی سے آخرت کی ترقیاں بھی۔

قرآن کا مطلوب انسان وہ ہے جو غیب پر ایمان لائے۔ اس سلسلے میں قرآن کے متعلق الفاظ

یہ ہیں: الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (2:3)۔ یعنی وہ لوگ جو غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ غیب پر ایمان لانا

کیا ہے۔ یہ دوسرے لفظوں میں نامعلوم کو معلوم بنانا ہے۔ یعنی وہی چیز جس کو موجودہ زمانہ میں

دریافت (discovery) کہا جاتا ہے۔

دنیوی ترقی کے رازوں کو خدا نے زمین و آسمان کے اندر چھپا دیا ہے۔ انھیں رازوں کو قوانینِ فطرت (laws of nature) کہا جاتا ہے۔ سائنس میں انھیں رازوں (یا قوانینِ فطرت) کو دریافت کیا جاتا ہے۔ جو قوم ان رازوں کو دریافت کرے وہ دوسروں سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں ہم مغربی اقوام کو یا ایشیا میں جاپان کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ترقی یافتہ قوموں (developed countries) کو تمام ترقیاں ان کی انھیں دریافتوں کی بنیاد پر حاصل ہوئی ہیں۔

اسی طرح عالمِ آخرت کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی نظروں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ اب انسان کو اسے دریافت کرنا ہے۔ جو چیزِ غیب میں ہے اس کو شہود میں لانا ہے۔ اسی دریافت یا اکتشاف کا نام ایمان ہے۔ جو شخص اس ایمان میں جتنا زیادہ آگے ہوگا وہ آخرت میں اتنا ہی زیادہ ترقی اور کامیابی حاصل کرے گا۔

12 ستمبر 1985

ایک مسنون دعا ان الفاظ میں آئی ہے: مَنْ أَكَلَ طَعَامًا فَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي هَذَا وَزَقَّنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّةٍ، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ (جامع الترمذی، حدیث نمبر 3458)۔ یعنی جو شخص کوئی چیز کھائے اور کہے کہ شکر اور تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے یہ کھلایا اور میری کسی کوشش یا طاقت کے بغیر مجھ کو روزی عطا کی تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔

یہ دعا محض کھانے والے کے الفاظ کو نہیں بتاتی بلکہ دراصل اس احساس کو بتاتی ہے جس کے تحت ایک مومن خدا کے رزق کو کھاتا ہے۔ وہ چیز جس کو ”کھانا“ کہا جاتا ہے وہ ایک عظیم خدائی تخلیق ہے۔ وہ براہِ راست خدا کی قدرت سے وجود میں آتا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو پالے اس کا احساس انھیں الفاظ میں ڈھل جائے گا جو مذکورہ حدیث میں بیان ہوتے ہیں۔ اور جس کا احساس ان الفاظ میں ڈھل جائے وہ یقیناً اتنا بڑا عمل کرتا ہے کہ عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے گناہوں کو معاف کر دے۔



13 ستمبر 1985

میں نے اپنے تجربے میں پایا ہے کہ بیش تر لوگ مایوسی کا شکار رہتے ہیں۔ وہ مایوسی کے احساس میں جیتے ہیں اور مایوسی میں مر جاتے ہیں۔ اس المیہ کا بنیادی سبب کیا ہے۔ وہ سبب یہی ہے کہ بیش تر لوگ اپنی زندگی کے لیے صحیح نقطہ آغاز نہیں پاتے، اور جب آپ صحیح نقطہ آغاز کو نہ پائیں تو آپ کی تمام سرگرمیاں آپ کے مطلوب کے اعتبار سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

اس دنیا میں قانونِ فطرت کے مطابق، کسی انسان کے لیے جو چیز قابل عمل ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ ممکن اور ناممکن کے درمیان فرق کرے، اور پھر اپنا منصوبہ بنائے، یعنی انڈیل کو چھوڑ کر پریکٹکل ورڈم کو اختیار کرنا۔ آدمی کے لیے یہی درست نقطہ آغاز ہے۔

14 ستمبر 1985

اپنے بس میں صرف برداشت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے صرف دوسروں کے بس میں ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کے لیے ایک ہی ممکن طریق کار ہے۔ وہ اپنے بس والے مقام سے آغاز کرے۔ اگر اس نے وہاں سے آغاز کرنا چاہا جو دوسرے کے بس میں ہے تو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اس نے حقیقتاً آغاز ہی نہیں کیا، اور جو شخص آغاز نہ کرے، وہ اختتام کو کس طرح پہنچ سکتا ہے۔

15 ستمبر 1985

نئی دہلی کے انگریزی اخبار ٹائمز آف انڈیا (15 ستمبر 1985) نے ہندستان کے معاشی اور سیاسی حالات پر ایک مضمون شائع کیا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

Ours is a Story of Missed Opportunities

ہماری کہانی کھوئے ہوئے مواقع کی کہانی ہے۔

یہ بات ملک سے زیادہ مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔ مسلمانوں نے موجودہ زمانے میں سب سے بڑی نادانی یہ کی ہے کہ انھوں نے مواقع اور امکانات کو نہیں پہچانا۔ وہ انتہائی قیمتی مواقع کو انتہائی بے دردی کے ساتھ ضائع کرتے رہے۔ اس کا نتیجہ ان کی وہ ناکامی ہے جس سے آج وہ دوچار ہیں۔

16 ستمبر 1985

اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ یہاں دینے والا پاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے کچھ نہ ہو تو آپ بھی دوسروں سے کچھ نہیں پاسکتے۔  
دوسروں کے لیے نفع بخش بنئے، اور اگر آپ نفع بخش نہیں بن سکتے تو دوسروں کو اپنے ضرر سے بچائیے۔ دوسروں کو اپنے ضرر سے بچانا بھی انہیں کچھ دینا ہے۔ اگر آپ دوسروں کو نہیں دے سکتے تو دوسروں سے چھیننے کی بھی کوشش نہ کیجیے۔

18 ستمبر 1985

جولائی 1402ء میں انگورہ (Angora) کے میدان میں دو مسلم بادشاہوں کی لڑائی ہوئی۔ ایک طرف تیموری سلطنت کا بانی سلطان تیمور (1336-1405ء) تھا، دوسری طرف عثمانی سلطان بایزید اول (1403-1360ء)۔ یہ ایک نہایت خوف ناک جنگ تھی۔ اس میں تیمور کی فوج کے ایک لاکھ آدمی قتل ہوئے اور بایزید کی فوج کے صرف پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کے باوجود شکست سلطان بایزید کے حصہ میں آئی۔

اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی سادہ وجہ یہ تھی کہ سلطان تیمور کی فوج میں پانچ لاکھ سپاہی تھے۔ جب کہ سلطان بایزید کی فوج میں کل ایک لاکھ سپاہی تھے۔ اس طرح سلطان تیمور کی فوج کے ایک لاکھ آدمی قتل ہونے کے بعد بھی اس میں چار لاکھ آدمی باقی تھے، اور سلطان بایزید کی فوج میں کل ایک لاکھ آدمی تھے۔ چنانچہ پچاس ہزار آدمیوں کے قتل ہو جانے کے بعد اس میں صرف پچاس ہزار آدمی باقی رہ گئے۔  
سلطان بایزید بے حد بہادر آدمی تھا۔ مگر کیفیت (quality) کی زیادتی کمیت (quantity) کی کمی کو ایک حد تک ہی پورا کر سکتی ہے۔ اگر فریقین کے درمیان کمیت کے تناسب میں غیر معمولی فرق واقع ہو جائے تو کیفیت کی زیادتی کمیت کی کمی کی تلافی کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔

19 ستمبر 1985

موجودہ زمانے کے ماہرین نے اندازہ لگایا ہے کہ انسان کے دماغ (brain) میں جو

پارٹیکل ہیں، وہ پوری کائنات کے مجموعی پارٹیکل سے بھی زیادہ ہیں۔ انسانی دماغ کی استعداد بے پناہ ہے، مگر کوئی بڑے سے بڑا انسان بھی اب تک اپنے دماغ کو دس فی صد سے زیادہ استعمال نہ کر سکا۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی ایک امکان ہے۔ مگر موجودہ دنیا اپنی محدود دیتوں کے ساتھ اس امکان کے ظہور کے لیے ناکافی ہے۔ انسانی امکان کے ظہور میں آنے کے لیے ایک لامحدود اور وسیع تر دنیا درکار ہے — جنت کی دنیا، ایک اعتبار سے، اسی لیے بنائی گئی ہے کہ وہاں آدمی کے امکانات پوری طرح ظہور میں آسکیں۔

20 ستمبر 1985

اناتول فرانس (Anatole France, 1844-1924) کا قول ہے کہ یہ آدمی کی فطرت

ہے کہ وہ دانش مندانہ طور پر سوچتا ہے، مگر بیوقوفی کے ساتھ عمل کرتا ہے:

It is human nature to think wisely and act foolishly.

یہ بات بذاتِ خود صحیح ہے۔ مگر اس کی وجہ انسانی فطرت نہیں، بلکہ انسانی عادت ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ معاملات میں دانش مندانہ طور پر سوچ سکے۔ مگر عمل کرتے وقت وہ بے وقوف بن جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ سوچ کے وقت تو غیر جانب دار رہتا ہے۔ مگر عمل کے وقت اپنی غیر جانب داری کو باقی نہیں رکھ پاتا — صحیح عمل اکثر اپنی ذات کی نفی پر ہوتا ہے۔ آدمی اپنی ذات کی نفی پر راضی نہیں ہوتا، اس لیے وہ صحیح عمل بھی نہیں کر پاتا۔

21 ستمبر 1985

اجتماعی زندگی میں وہ انسان بہت قیمتی ہوتا ہے جو بلا شرط کسی مشن کا ساتھ دے۔ جو ساتھ دینے کے بعد مسائل کا جنگل نہ کھڑا کرے۔ صحابہ کرام نے تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا۔ ان کی تحریکی صفات کو اگر ایک لفظ میں بتانا ہو تو کہا جاسکتا ہے — وہ بے مسئلہ لوگ (no-problem person) تھے۔ وہ اختلاف کو بھول کر مشن سے وابستہ رہتے تھے۔ وہ ذاتی شکایت کو نظر انداز کر کے قیادت کے حکم کی پابندی کرتے تھے۔ وہ انفرادی احساسات کو کچل کر اجتماعی تقاضوں کو پورا

کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بے مسئلہ انسان ہوں، وہی دنیا کا مسئلہ حل کرتے ہیں۔ جو لوگ خود مسائل میں مبتلا ہو جائیں، وہ صرف دنیا کے مسائل میں اضافہ کرتے ہیں، وہ کسی بھی درجے میں دنیا کے مسائل کو کم نہیں کرتے۔

23 ستمبر 1985

شہر کی تعمیرات اور اس کے تمدنی مظاہر کو دیکھ کر میری زبان سے نکلا: ”انسان کے بغیر یہ تمدن نہیں، اسی طرح خدا کے بغیر یہ کائنات نہیں۔“

24 ستمبر 1985

نادر شاہ افشار (1688-1747) ایران کا بادشاہ تھا۔ وہ 1736 سے 1747 تک ایران کا بادشاہ رہا۔ ایک مرتبہ اس کو یہ شبہ ہوا کہ اس کا لڑکا یہ سازش کر رہا ہے کہ وہ باپ کو ہٹا کر خود تخت پر بیٹھ جائے۔ نادر شاہ نے اپنے جوان لڑکے کو گرفتار کیا اور اس کی آنکھیں نکال کر اس کو اندھا کر دیا۔ مگر نادر شاہ کی یہ بے رحمی اس کو اقتدار پر باقی رکھنے میں معاون نہ ہو سکی۔ جلد ہی اس کی فوج میں اس کے مخالفین پیدا ہو گئے، اور نادر شاہ خود اپنے فوجیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔

اس طرح کے بے شمار واقعات تاریخ میں موجود ہیں۔ مگر کوئی ان سے سبق نہیں لیتا۔ ہر آدمی اپنے دائرے میں دوبارہ وہی کرتا ہے، جو نادر شاہ نے اپنے دائرے میں کیا تھا۔

25 ستمبر 1985

ایک صاحب نے الرسالہ کے مشن سے پورا اتفاق کیا۔ میں نے کہا کہ جب آپ کو الرسالہ سے اتفاق ہے تو اس کی ایجنسی لے کر اس کو پھیلائیے۔ انھوں نے کہا کہ ابھی تو میں صرف خود پڑھتا ہوں۔ آئندہ ایسا بھی کروں گا کہ ایجنسی لے کر اس کو دوسروں تک پہنچاؤں۔

میں نے کہا کہ کرنے کا کام آج کیا جاتا ہے، کل نہیں کیا جاتا۔ جس شخص نے معاملے کو کل (tomorrow) کے خانہ میں ڈالا، اس نے معاملہ کو نہیں کے خانے میں ڈال دیا۔

26 ستمبر 1985

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: نِعْمَتَانِ مَغْبُورٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ: الصِّحَّةُ وَالْفَرَاعُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6412)۔ یعنی عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: دو نعمتیں ہیں جن میں انسانوں میں سے بہت سے لوگ دھوکا کھاتے ہیں — تندرستی اور فرصت۔

یعنی آدمی ایک کام کو کرنے کا کام سمجھتا ہے۔ مگر وہ سوچتا رہتا ہے کہ جب تندرستی ہوگی تو کر لوں گا یا جب فرصت ہوگی کر لوں گا۔ حالاں کہ یہ زبردست بھول ہے۔ جو آدمی عذر کے فریب میں رہے وہ کبھی کوئی کام نہیں کر سکتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ عذر کو نظر انداز کر کے کام کیا جائے۔ ایک انگریزی مقولہ اس حدیث کی بہترین تشریح ہے۔ وہ مقولہ یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس ایک اچھا عذر ہے تب بھی اس کو استعمال نہ کرو:

If you have a good excuse, don't use it.

27 ستمبر 1985

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں بنی اسرائیل کا جو حال تھا، وہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ مسلمان اب ایک مردہ قوم بن چکے ہیں، وہ کسی گہرے تعمیری کام کا حامل بننے کی طاقت نہیں رکھتے۔

بنی اسرائیل کا یہی حال ہو گیا تھا۔ چنانچہ حضرت موسیٰ ان کو صحرائے سینا میں لے گئے۔ جب ان کی ابتدائی نسل ختم ہو گئی اور نئی نسل صحرا کے ماحول میں پرورش پا کر تیار ہوئی تو اسی نے دوبارہ کام کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ہندستان مسلمانوں کا ”صحرائے سینا“ ہے۔ ہندستان وہ مقام ہے جہاں وہ عمل جاری ہے، جو بنی اسرائیل کے ساتھ صحرائے سینا میں انجام پایا تھا۔ اس بنا پر مجھے صرف ہندستان سے یہ امید معلوم ہوتی ہے کہ آئندہ کسی وقت یہاں کے مسلمان کسی زندہ اسلامی دعوت کے علم بردار بن سکیں۔ ہندستان میں بہت بڑے پیمانہ پر یہ عمل جاری ہے کہ

یہاں کے لوگوں کو تربیت کے سخت کورس سے گزارا جا رہا ہے۔ یہ کورس جب مکمل ہوگا تو یہاں کے مسلم افراد میں، ان شاء اللہ، وہ سنجیدگی اور حقیقت پسندی آچکی ہوگی، جو اسلام کی دعوت کا حامل بننے کے لیے ضروری ہے۔

28 ستمبر 1985

پیسہ خرچ کرنے کے سلسلے میں قرآن میں اعتدال کا حکم دیا گیا ہے: **وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسِطِ فَتَقْعَدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا** (17:29)۔ یعنی اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔ حدیث میں آیا ہے: **مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ** (مسند احمد، حدیث نمبر 4269)۔ یعنی جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہیں ہوا۔

اکثر پریشانیوں کا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اخراجات میں اعتدال کی حد پر قائم نہیں رہتا۔ شادی کرنا، گھر بنانا، اور اس طرح کے دوسرے اخراجات کا مسئلہ سامنے آتا ہے تو وہ اپنی طاقت سے زیادہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ اگر ایسے مواقع پر اپنی وسعت کو دیکھا جائے، نہ کہ کسی مفروضہ معیار کو، تو کبھی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

30 ستمبر 1985

اینڈریو کارنیگی (1835-1919) نے اسٹیل کی صنعت میں کافی ترقی کی۔ 1889 میں اس نے ایک مقالہ شائع کیا جس کا نام تھا دولت کی بائبل (The Gospel of Wealth)۔ اس مقالہ میں اس نے بتایا کہ دولت مند آدمی جب دولت حاصل کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی دولت کو رفاہ عام کے کام میں لگائے:

A rich man should, after acquiring his wealth, distribute the surplus for the general welfare. (Andrew Carnegie)

یہ ایک نہایت اہم اصول ہے۔ اینڈریو کارنیگی نے جو بات سماجی اصطلاح میں کہی وہی بات پیغمبر اسلام نے مذہبی اصطلاح میں اس طرح کہی ہے کہ خدا تمہیں دولت دے تو تم دائیں بائیں

اور آگے پیچھے خرچ کرو (صحیح مسلم، حدیث نمبر 990)۔

یہ اصول نہ صرف آخرت کی فلاح کا ضامن ہے بلکہ دنیا کی ترقی بھی اسی سے ملتی ہے۔ موجودہ زمانے میں کئی ملکوں میں بیرونی افراد کے خلاف سخت ناراضگی پیدا ہوئی۔ مثلاً افریقن ملک یوگنڈا میں ایشیائی لوگوں کے خلاف، سری لنکا میں تامل والوں کے خلاف، پاکستان میں مہاجرین کے خلاف، وغیرہ۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ان لوگوں نے اپنی کمائی ہوئی دولت کو صرف اپنی ذات پر خرچ کیا، مقامی آبادی پر خرچ نہیں کیا۔

جو تجارتی قومیں اس راز سے واقف ہیں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ مستقل طور پر مقامی آبادی کی فلاح پر خرچ کرتی ہیں۔ چنانچہ وہ نہایت کامیاب ہیں۔ مثال کے طور پر ہندستان میں جینی فرقہ اور پارسی فرقہ۔ یہ لوگ بہت چھوٹی اقلیت ہیں۔ اس کے باوجود ملک کی دولت کا بڑا حصہ ان کے قبضہ میں ہے۔ مگر آج تک ان کے خلاف کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ ہر سال دوسروں کے اوپر خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً اسکول، اسپتال، تعلیمی وظائف وغیرہ وغیرہ۔

11 اکتوبر 1985

علمائے تفسیر کا کہنا ہے کہ قرآن کی تفسیر کا مصدر اول خود قرآن ہے۔ اور قرآن کی تفسیر کا مصدر دوم وہ حدیث کو قرار دیتے ہیں۔

مثلاً سورہ فاتحہ میں ہے: غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ (1:7)۔ یعنی ان کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ ان لوگوں کا راستہ جو راستے سے بھٹک گئے۔ یہاں سوال ہے کہ اس سے مراد کون لوگ ہیں۔ حدیث رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ مغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں اور ضالین سے مراد نصاریٰ (مسند احمد، حدیث نمبر 19381)۔

اسی طرح قرآن میں ہے: وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (8:60)۔ یعنی اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت۔ یہاں قوت سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلہ میں حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَلَا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمِّيَّ، أَلَا إِنَّ

الْقُوَّةَ الرَّغْبِيَّ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1917)۔ جان لو کہ قوت سے مراد تیرا انداز ہی ہے، جان لو کہ قوت سے مراد تیرا انداز ہی ہے، جان لو کہ قوت سے مراد تیرا انداز ہی ہے۔

تاہم ان مصادر (sources) کے ساتھ ایک اور چیز انتہائی ضروری ہے، اور وہ ہے تفقہ (حکمت و بصیرت)۔ اگر تفقہ نہ ہو تو آدمی فرسٹ مصدر اور سیکنڈ مصدر کا ماہر ہونے کے باوجود قرآن کی درست تفسیر نہ کر سکے گا۔ مثلاً پہلی آیت (الفاتحہ، 1:7) کی تفسیر میں مذکور حدیث میں صرف آدھی بات ہے۔ مکمل بات ایک دوسری حدیث کو ملانے سے سمجھ میں آتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں امت مسلمہ کے بارے میں آیا ہے: لَتَتَّبَعَنَّ مَنَ كَانَ قَبْلَكُمْ، شَبْرًا شِبْرًا وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ، حَتَّىٰ لَوْ دَخَلُوا جُحْرَ صَبَّ تَبِعْتُمُوهُمْ، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ؟ قَالَ: فَهَنُ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7320)۔ یعنی تم ضرور پچھلی امتوں کی پیروی کرو گے، قدم بہ قدم، یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے بل میں داخل ہوئے ہیں تو تم بھی ضرور اس میں داخل ہو جاؤ گے، ہم نے کہا: اے خدا کے رسول، یہود و نصاریٰ، آپ نے کہا: اور کون۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے بگاڑ پیدا ہونے کے بعد جو کچھ کیا وہی سب مسلمان بھی بعد کے زمانے میں کریں گے۔ ان دونوں حدیثوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت میں مغضوب اور ضالین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے زوال یافتہ ذہنیت کی وجہ سے خدا کی ناراضگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہود و نصاریٰ نے ایسا کیا تھا، بعد کے زمانے میں امت محمدی پر ایسا وقت آسکتا ہے۔

اسی طرح دوسری آیت (الانفال، 8:60) کی تفسیر میں مذکور حدیث کو بھی بالکل لفظی معنی میں لے لیا جائے تو اسلام ایسی سائیکل کی مانند بن جائے گا، جس کا ہینڈل کس دیا گیا ہو، اور وہ سائیکل دائیں بائیں گھوم نہیں سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری آیت کی یہ تفسیر ایک زمانی تفسیر ہے، نہ کہ ابدی تفسیر۔ اگر اس تفسیر کو ابدی تفسیر قرار دیا جائے تو بعد کے ادوار میں مسلمانوں نے فوجی قوت کے لیے جو نئے نئے اضافے کیے، وہ سب غیر اسلامی قرار پائیں گے۔ یا کم از کم یہ کہ بدلتے ہوئے زمانہ کے



لحاظ سے دفاعی قوت کی فراہمی کے لیے قرآن سے انحراف ضروری ہوگا۔ ورنہ ہم اپنے دور کے لحاظ سے اپنے کو طاقت ور نہیں بنا سکتے۔

13 اکتوبر 1985

مسز انیس جنگ کی ایک انگریزی کتاب 1985 میں پنگوئن بکس کے تحت چھپی ہے، جس کا نام ہے ”ہندستان بے نقاب“ (Unveiling India)۔ مصنفہ نے ہندستان میں عورتوں کے حالات کی تحقیق کے لیے ملک کے مختلف حصوں کے سفر کیے۔ بیدر میں ان کی ملاقات جلال الدین چنگیزی سے ہوئی۔ مصنفہ کے بیان کے مطابق، جلال الدین چنگیزی نے کہا کہ قرآن میں عورت کو فتنہ بتایا گیا ہے، وہ جو مرد کو بہکائے اور اس کو مصیبت میں مبتلا کرے:

In the Koran she is described as a *fitna*, one who tempts man and brings trouble (p. 30)

یہ حوالہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ قرآن میں ایسی کوئی آیت نہیں جس میں عورت کو فتنہ کہا گیا ہو۔ البتہ ایک حدیث ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں: مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةٌ أَضَرَّ عَلَى الرَّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5096)۔ یعنی اپنے بعد میں نے سب سے زیادہ مضر فتنہ جو مردوں کے اوپر چھوڑا ہے وہ عورتیں ہیں۔

حدیث کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس میں مستقبل کے بارے میں ایک پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اور وہ یہ کہ آئندہ آنے والے دور میں انسانی سماج میں سب سے زیادہ ضرر کا سبب عورتیں بنیں گی۔ اس دور میں عورتیں مردوں کے لیے سب سے بڑی آزمائش بن جائیں گی۔

جس زمانے میں محترمہ انیس جنگ نے اپنی کتاب لکھی ہے، اس زمانے میں یہ پیشین گوئی اپنی کامل صورت میں سامنے آچکی ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ جدید دنیا کے معاشرتی بگاڑ کا سب سے بڑا سبب ”جدید عورت“ ہے۔ آج آزادی نسواں کے نام پر عورت کا جو حال کیا گیا ہے اس نے جدید معاشرہ کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔

اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ عورت باعتبار تخلیق کوئی بری چیز ہے۔ اس میں صرف عورت کے اس غلط استعمال کا ذکر ہے جس کے نتیجے میں عورت سماج کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔

14 اکتوبر 1985

مولانا امیر اللہ خاں قاسمی ایک عربی مدرسہ چلاتے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک دلچسپ واقعہ بتایا۔ ایک سفر میں ان کی ملاقات ایک عرب سے ہوئی۔ عرب نے گفتگو کے دوران کہا:

چُنْسُكَ جَيِّدًا

مولانا امیر اللہ صاحب اس جملہ کو سمجھ نہ سکے۔ انھوں نے عرب سے دوبارہ پوچھا کہ ”چُنْسُكَ“ کا مطلب کیا ہے۔ اس نے کاغذ پر لکھ کر بتایا تو معلوم ہوا کہ وہ کہہ رہا ہے: تمہارا چانس (chance) بہت اچھا ہے — عربوں میں انگریزی الفاظ کتنے زیادہ عام ہو گئے ہیں، اس کی یہ ایک دلچسپ مثال ہے۔

15 اکتوبر 1985

قرآن کے سلسلہ میں ایک مسئلہ اختلاف قرأت کا ہے۔ مگر اختلاف قرأت کا مطلب اختلاف متن نہیں ہے۔ قرآن میں جو اختلاف قرأت ہے وہ دو قسم کا ہے۔ ایک وہ اختلاف جو لہجہ (accent) کے فرق کا نتیجہ ہے۔ چونکہ عرب کے مختلف قبائل میں الفاظ کی ادائیگی میں بعض فرق پایا جاتا تھا، اسی بنا پر قرآن کی قرأت میں بھی بعض مقامات پر فرق ہو گیا۔ مثلاً مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ (1:4) کے بجائے مَلِكِ يَوْمِ الدِّينِ (میم کے بعد الف کے بغیر) یا قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ (114:1) کی جگہ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ، وغیرہ۔ اس قسم کا فرق صرف پڑھنے کا فرق ہے، ان میں کتابت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

اختلاف قرأت کی دوسری صورت وہ ہے جس میں لفظ کا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے: أَوْ يَكُونُ لَكَ بَيْدٌ مِّنْ رُّحُوفٍ (17:93)۔ یعنی یا تمہارے پاس سونے کا کوئی گھر ہو جائے۔ اس آیت کو حضرت عبد اللہ بن مسعود نے پڑھا: أَوْ يَكُونُ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ ذَهَبٍ (تفسیر ابن کثیر،

جلد 5، صفحہ 120)۔ یا مثلاً سورہ الجمعہ میں ہے: فَاسْعُوا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (62:9)۔ یعنی اللہ کی یاد کی طرف چل پڑو۔ اس کو بعض صحابہ نے اس طرح پڑھا: فَامضُوا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ (تفسیر ابن کثیر، جلد 8، صفحہ 120)۔ یا مثلاً سورہ البقرہ میں ہے: لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ (2:198)۔ یعنی تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔ اس کو ابن عباس نے اس طرح پڑھا ہے: لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِنْ رَبِّكُمْ فِي مَوَاسِمِ الْحَجِّ (فضائل القرآن للقاسم بن سلام، صفحہ 325)۔ یعنی تم پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو حج کے زمانے میں۔

اختلاف قرأت کی یہ دوسری مثالیں قرآن کا حصہ نہیں ہیں۔ وہ تفسیر کی قبیل سے ہیں۔ یعنی صحابی نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے ایک نیا لفظ استعمال کیا تا کہ مخاطب اس کو سمجھ سکے۔ ورنہ دنیا میں ایسا کوئی قرآن موجود نہیں جس میں متن کی کتابت اس دوسرے طریقے سے کی گئی ہو۔ کسی عبارت کے مفہوم کو کھولنے کے لیے اس کے لفظ کو بدلنا پڑتا ہے۔ اختلاف قرأت کی دوسری قسم کا مطلب یہی ہے، صحابہ نے تقہیم کے مقصد سے لفظ بدل کر پڑھا۔

17 اکتوبر 1985

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آپ کے حکم سے کئی مؤذنون کی تقریریاں ہوئی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت بلال ان مؤذنون کے صدر تھے۔ جب کوئی حکم ہوتا تو حضرت بلال کے واسطے سے تمام دوسرے لوگوں کو اس سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مثلاً ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: أَمَرَ بِلَالًا أَنْ يَشْفَعَ الْأَذَانَ، وَأَنْ يُوتِرَ الْإِقَامَةَ (سنن النسائي، حدیث نمبر 627)۔ یعنی آپ نے بلال کو حکم دیا کہ وہ اذان میں تشفیغ کرے اور اقامت میں ایثار کرے۔

اس قسم کی روایتوں کا مطلب احناف اس طرح بتاتے ہیں: أَنْ يَكُونَ الْمُرَادُ مِنْ أَنْ يَشْفَعَ الْأَذَانَ: بِالصَّوْتِ، فَيَأْتِي بِصَوْتَيْنِ صَوْتَيْنِ، وَيُوتِرُ الْإِقَامَةَ فِي الصَّوْتِ (تجرید القدری، جلد 1، صفحہ 419)۔ یعنی اس سے مراد یہ ہے کہ وہ اذان میں شفیغ کرے، اس کو دو دو (اونچی) آوازیں

ادا کرے، اور اقامت کو اکھرے (پنجی) آواز میں ادا کرے۔ فمحمول علی ایتار صوتہا بأن یحدر فیہا... لا ایتار ألفاظہا (البحر الرائق، جلد 1، صفحہ 447)۔ یعنی اس کا مطلب ہے کہ اس کی آواز میں ایتار ہو، یعنی وہ اقامت میں جلدی جلدی پڑھے، نہ کہ الفاظ میں ایتار (ایک ایک مرتبہ)۔ اس کے برعکس شوافع وغیرہ کا کہنا ہے کہ یہاں تشفیح اور ایتار کا مطلب یہ ہے کہ اذان کے کلمات دوبار ادا کیے جائیں اور اقامت کے کلمات ایک بار — حدیث میں تعمق اور تدقیق (hair-splitting) نے کیسے عجیب عجیب اختلافات پیدا کر دیے ہیں۔

18 اکتوبر 1985

جناب فرید الوحدیدی صاحب جدہ میں رہتے ہیں۔ ان کا قدیم وطن دیوبند تھا۔ اب وہ سعودی شہری ہو چکے ہیں اور وہاں کے ایک کامیاب تاجر ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی کا تجربہ ان الفاظ میں بیان کیا:

جو چیونٹی بن کر رہتا ہے وہ شکر کھاتا ہے جو شیر بن کر رہتا ہے وہ گولی کھاتا ہے

19 اکتوبر 1985

ایک عرب سے ملاقات ہوئی۔ ان کو میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ قول سنایا: إِنَّ لِلَّهِ عِبَادًا يُمَيِّنُونَ الْبَاطِلَ بِهَجْرِهِ (حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 55)۔ یعنی بے شک اللہ کے کچھ بندے ہیں، جو باطل کو مٹاتے ہیں، اس کو ترک کر کے۔

انھوں نے اس کو پسند کرتے ہوئے کہا کہ اسی مفہوم کا ایک مقولہ عربوں میں رائج ہے جو کہ اس طرح ہے: لَوْ أَنَّ الْكَلَامَ مِنْ فِضَّةٍ لَكَانَ السُّكُوتُ مِنْ ذَهَبٍ (الزهد لابن ابی عاصم، اثر نمبر 33)۔ یعنی بولنا اگر چاندی ہو تو چپ رہنا سونا (gold) ہے۔

10 اکتوبر 1985

سترھویں صدی کے فرینچ رائٹر اور مفکر جین دی لا برویر (Jean de La Bruyère, 1645-1696) کا قول ہے کہ اس دنیا میں صرف دو طریقے ہیں جن کے ذریعے آدمی اپنے آپ کو

اوپر اٹھا سکتا ہے۔ یا تو اپنی ذاتی محنت سے یا دوسروں کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر:

In the world there are only two ways of raising one self, either by one's own industry or by the weakness of others.

اس کی ایک مثال ہندستان ہے، اور دوسری مثال جاپان کی جدید تاریخ ہے۔ ہندستان نے 1947 میں جو آزادی حاصل کی، وہ دراصل دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جاپان نے زبردست ترقی حاصل کی۔ اس کاراز جاپانی قوم کی وہ محنت تھی جو اس نے جنگ میں شکست کے بعد مسلسل انجام دی۔

11 اکتوبر 1985

میر انبیال یہ ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کے پاس قومی حیثیت سے مثبت احساس موجود نہیں ہے۔ واحد چیز جو ان کے پاس ہے وہ مخالف ہندو احساس (anti-Hindu feeling) ہے۔ اسی پر موجودہ زمانہ کے مسلمان کھڑے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی تحریک اٹھتی ہے جس میں ہندو کے خلاف جذبات کے لیے اپیل ہو تو فوراً مسلمانوں کی بھیڑ کی بھیڑ اکھٹا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور دعوت پر ان کی بھیڑ جمع نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانے کے قائدین نے مسلمانوں کے اس احساس کو بھرپور طور پر استعمال کیا ہے۔ ہر وہ مسلم قائد جس نے موجودہ زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل کی ہے، اس نے یہ مقبولیت اسی مخالفہ احساس کو استعمال کر کے حاصل کی ہے۔ مگر میں اس قسم کی قیادت کو سراسر باطل سمجھتا ہوں۔ کسی قوم کو مثبت نفسیات پر اٹھانا قیادت ہے، اور کسی قوم کو منفی نفسیات پر اٹھانا ہلاکت۔

12 اکتوبر 1985

مسلم رہنماؤں نے ملک کی تقسیم (1947) اس لیے کرائی تھی کہ اس سے ہندو مسلم مسئلہ ختم ہو جائے گا۔ مگر نتیجہ ان کے اندازے کے بالکل برعکس نکلا۔ تقسیم نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو اور بڑھا دیا۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) نے بالکل درست لکھا ہے:

After Partition of the Subcontinent into India and Pakistan,

the political controversies between India and Pakistan constituted a complication (EB. 8/907)

یعنی انڈیا اور پاکستان کی صورت میں برصغیر کی تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں سیاسی اختلافات پہلے سے بھی زیادہ ہو گئے۔

اس نتیجہ کو بطور واقعہ خود مسلم قائدین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اس کی ذمہ داری وہ یک طرفہ طور پر ہندو اکثریت پر ڈالتے ہیں۔ ان کی یہ روش بھی کس قدر عجیب ہے۔ جو نتیجہ ان کی اپنی سیاسی فکر کو غلط ثابت کر رہا تھا، اس کو انھوں نے دوبارہ دوسروں کو ملزم ٹھہرانے کا ذریعہ بنا لیا۔ سوال یہ ہے کہ تقسیم کے آپریشن کے باوجود اگر حالات کی باگ ڈور بدستور ”ہندو“ کے ہاتھ میں ہے تو اس ہولناک آپریشن کی کیا ضرورت۔

14 اکتوبر 1985

جنت کے بارے میں قرآن میں ”عُنْدَكَ“ اور ”عِنْدَكَ رِبِّهِمْ“ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ جنت مجلسِ خداوندی میں جگہ پانے کا دوسرا نام ہے۔ خدا کی صفتِ خاص یہ ہے کہ وہ پرفکٹ (perfect) ہے۔ خدا کے قریب جو دنیا ہوگی وہاں ہر چیز پرفکٹ ہوگی۔ وہاں پرفکٹ باتیں ہوں گی۔ پرفکٹ سلوک ہوگا۔ پرفکٹ سامان ہوں گے۔ یہ ایک پرفکٹ ماحول ہوگا، اور پرفکٹ ماحول میں جینے ہی کا نام جنت ہے۔

یہ پرفکٹ دنیا (perfect world) اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ انسان کا کوئی بھی عمل، خواہ وہ کتنی ہی مقدار میں ہو، اس کی قیمت نہیں بن سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو اپنے عمل کی قیمت پر جنت میں جگہ نہیں مل سکتی۔ صرف ایک چیز ہے جو جنت کی قیمت ہے۔ اور وہ ہے پرفکٹ تھکنگ۔ آدمی عمل کی سطح پر پرفکٹ نہیں بن سکتا۔ مگر سوچ (thinking) کی سطح پر وہ پرفکٹ بن سکتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو موجودہ دنیا میں آدمی کو حاصل کرنا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو کسی آدمی کو جنت میں داخلے کا مستحق بنائے گی۔

15 اکتوبر 1985

عربی زبان میں غیر معمولی طور پر یہ صلاحیت ہے کہ وسیع مضامین کو مختصر لفظوں میں ادا کر سکے۔ غالباً کسی اور زبان میں یہ صلاحیت اتنی زیادہ نہیں۔

ماہنامہ العربی (کویت) کی اشاعت اکتوبر 1985 میں صفحہ 32 پر ایک تصویر ہے۔ اس تصویر میں ایک عرب شیخ اپنے مخصوص حلیہ میں چھڑی لیے ہوئے کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے ایک ہرے بھرے فارم کی تصویر ہے جس میں کھیت اور باغ دکھائی دے رہے ہیں۔ اس تصویر کے اوپر (فارم کی زبان سے) لکھا ہوا ہے — انھوں نے بویا تو ہم نے کھایا، ہم تو تے ہیں تاکہ وہ کھائیں:

زرعوا فأکلنا، ونزرع لیبأکلوا

یعنی ہماری پچھلی نسلوں نے درخت لگائے جن کا پھل ہم کو ملا۔ اب ہم درخت لگا رہے ہیں تاکہ ہمارے بعد کی نسلیں اس کا پھل پاسکیں۔ جو لوگ عربی زبان اور اس کے ساتھ دوسری زبانیں جانتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس تصور کو اتنے کم الفاظ میں اتنی خوبصورتی کے ساتھ ادا کرنا کسی اور زبان میں شاید ممکن نہیں۔

16 اکتوبر 1985

ایمان ایک دریافت ہے، اور دعوت اس دریافت کا ایک خارجی اظہار۔ شرعی اعتبار سے دعوت ایک خدائی حکم کی تعمیل ہے۔ اور نفسیاتی اعتبار سے ایک اندرونی تپش کا بے قرارانہ اظہار۔ دعوت کے ایک خدائی حکم ہونے کا شعور نہ ہو تو آدمی استقلال کے ساتھ اس پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اگر دعوت کے پیچھے نفسیاتی انقلاب کی زمین موجود نہ ہو تو اس کے اندر وہ کیفیت اور وہ زور پیدا نہیں ہو سکتا جو سننے والے کو بلائے اور اس کو اپنی سوچ بدلنے پر مجبور کر دے۔

17 اکتوبر 1985

حدیث میں آیا ہے: الدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2956)۔ یعنی دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن خدا کے پڑوس میں رہنا چاہتا ہے اور دنیا میں اس کو انسانوں کے پڑوس میں رہنا پڑتا ہے۔ اس کی نظروں میں ”پرفکٹ“ سمایا ہوا ہوتا ہے اور دنیا میں اس کو ”امپرفکٹ“ سے نباہ کرنا پڑتا ہے۔ وہ کامل سچائی کا طلب گار ہوتا ہے اور دنیا میں وہ دیکھتا ہے کہ جھوٹ اور نا انصافی اور دھاندلی کی حکمرانی ہے۔ وہ اصول پسند ہوتا ہے جب کہ دنیا میں اس کو ہر طرف بے اصولی کا راج دکھائی دیتا ہے۔

غیر مومن با اصول یا آئیڈیلسٹ نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے صرف اپنا ذاتی مفاد ہوتا ہے، خواہ وہ جس طرح بھی ملے۔ وہ ہر صورت حال میں ڈھل کر اپنا مفاد محفوظ کر لیتا ہے۔ وہ صحیح اور غلط کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتا اسی لیے اسے کوئی پریشانی بھی لاحق نہیں ہوتی۔

18 اکتوبر 1985

خواجہ غلام الثقلین نے بیرونی ملکوں میں مسلمانوں کا تبلیغی مشن بھیجنے کی تجویز کی مخالفت کرتے

ہوئے لکھا تھا:

فرض کیجیے کہ کچھ حضرات یہ مشن لے کر جاتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے پیروؤں کے سامنے اسلامی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں کہ اسلام ہمیں سچائی، انصاف، کاروبار میں دیانت داری، روز مرہ زندگی میں باہمی تعاون، غریبوں کی مدد کرنا، شراب نوشی اور سود خواری سے دور رہنا سکھاتا ہے۔ تب ممکن ہے کہ وہ لوگ یہ دریافت کریں کہ کیوں صاحب، ہندستان کے مسلمان تو عام طور پر دیانت دار ہوں گے۔ آپ کے معاشرہ میں اقتصادی مساوات ہوں گی۔ اور وہاں نہ کوئی مسلمان شراب پیتا ہوگا اور نہ سود کھاتا ہوگا۔ اگر ہمارے مبلغین نے راست گوئی سے کام لیا تو انھیں کہنا پڑے گا کہ نہیں بھائی، ہمارے یہاں بھی یہ انفرادی واجتماعی خرابیاں موجود ہیں۔ تو پھر وہ ضرور یہ کہیں گے کہ آپ اپنے ملک واپس جا کر مسلمانوں میں اسلام کی تبلیغ کریں۔ اور جب وہ صحیح معنی میں مسلمان بن جائیں تو پھر آپ ہمارے پاس آ کر تلقین کریں۔ چنانچہ مسلمان کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ پہلے اپنے آپ کو سچا مسلمان بنانے کی کوشش کرے۔



خواجہ صاحب کی یہ تنقید صحیح نہیں۔ کیوں کہ تبلیغ کا مقصد لوگوں کو ”مسلم معاشرہ“ کی طرف بلانا نہیں ہے، بلکہ خدا کی طرف بلانا ہے۔ تبلیغ کا مقصد لوگوں کو حقیقتِ آخرت سے باخبر کرنا ہے، نہ کہ کسی دنیوی سماج سے باخبر کرنا۔

19 اکتوبر 1985

جنتِ صبر کے اُس پار ہے، مگر اکثر لوگ جنتِ صبر کے اِس پار تلاش کرنے لگتے ہیں۔

21 اکتوبر 1985

ایک صاحب تھے۔ وہ کسی سابق نواب کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ نوابی تو ختم ہو چکی تھی، مگر ”پدرم سلطان بود“ (میں بھی بادشاہ تھا) کی نفسیات ان کے اندر پوری طرح باقی تھیں۔ ان کی ایک لڑکی تھی۔ اس کا رشتہ کئی جگہ سے آیا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ کیوں کہ یہ رشتے ان کے خیال سے ان کے شایانِ شان نہ تھے، اور جس رشتہ کو وہ اپنے شایانِ شان سمجھتے تھے، وہ انھیں مل نہ سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی لڑکی کی شادی نہ ہو سکی۔

یہی کیس زیادہ بڑی شکل میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا ہے۔ مسلمانوں کی گزری ہوئی تاریخ نے ان کو ایک قسم کے احساسِ فخر میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس احساسِ فخر کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی چھوٹا کام انھیں اپنے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔ ہمیشہ بڑے کام کی طرف دوڑتے ہیں، کیوں کہ وہی کام ان کو اپنے شایانِ شان نظر آتا ہے جس کو بڑے بڑے لفظوں میں بیان کیا جاسکتا ہو۔

اسی احساسِ فخر کی نفسیات نے موجودہ زمانے کے تمام مسلم رہنماؤں کی کوششوں کو بے نتیجہ بنا دیا۔ موجودہ زمانے میں جو بھی مسلم رہنما اٹھا، اس نے ہمیشہ کسی بڑے کام کا نعرہ لگایا۔ ہر آدمی نے مینار پر کھڑا ہونا چاہا، کوئی بھی زمین پر کھڑا ہونے کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ بے شمار ہنگامہ خیز تحریکوں کے باوجود موجودہ زمانے میں مسلمانوں کی ملی تعمیر واقعہ نہ بن سکی۔ کیوں کہ حقیقی تعمیر کے لیے ہمیشہ چھوٹی سطح سے آغاز کرنا پڑتا ہے، مسلم رہنماؤں نے اپنی پرفر نفسیات کی بنا پر چھوٹی سطح کے کام کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھا، اس لیے وہ کوئی حقیقی تعمیری کام بھی انجام نہ دے سکے۔

122 اکتوبر 1985

زندگی دو متضاد پہلوؤں کے درمیان نباہ کرنے کا نام ہے۔ زندگی کا سفر ایک اعتبار سے تنی ہوئی رسی پر چلنے (tight-rope walking) کی مانند ہے۔ آدمی کو بیک وقت دو سمتوں کی رعایت کرتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔ اس دو طرفہ توازن میں اگر فرق آجائے تو زندگی کا سارا معاملہ بگڑ کر رہ جائے گا۔

123 اکتوبر 1985

قدیم زمانے میں اپنی محبوب شخصیت کو بڑھانے اور اپنی ناپسندیدہ شخصیت کو گھٹانے کے لیے بہت سے قصے گھڑے گئے۔ ایک مثال یہ ہے:

کہا جاتا ہے کہ امام ابوحنیفہ (150-80ھ) تحصیل علم کے لیے مدینہ گئے۔ وہاں ان کی ملاقات امام باقر (114-57ھ) سے ہوئی۔ تعارف کے بعد امام باقر نے کہا۔ کیا تم ہی قیاس کی بنا پر ہمارے دادا کی حدیثوں کی مخالفت کرتے ہو۔ ابوحنیفہ نے کہا عیاذ باللہ، حدیث کی کون مخالفت کر سکتا ہے۔ پھر مختصر گفتگو کے بعد دونوں میں حسب ذیل مکالمہ ہوا:

ابوحنیفہ: مرد ضعیف ہے یا عورت

امام باقر: عورت

ابوحنیفہ: وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا۔

امام باقر: مرد کا

ابوحنیفہ: اگر میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے۔ کیوں کہ ظاہر قیاس کی بنا پر ضعیف کو زیادہ ملنا چاہیے۔

امام باقر اس گفتگو کو سن کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر ان کی پیشانی چومی۔

نقد داخلی بتا رہا ہے کہ یہ ایک بناوٹی قصہ ہے۔ امام باقر نے امام ابوحنیفہ پر جو الزام لگایا وہ حدیث کو رد کرنے کا تھا، نہ کہ قرآن کو رد کرنے کا۔ جب کہ مذکورہ گفتگو کے مطابق امام ابوحنیفہ نے جو مسئلہ بیان کیا، وہ قرآن سے ثابت ہے۔ اس کا اخصار حدیث پر نہیں۔ امام ابوحنیفہ جیسا ذہین آدمی یہ

نہیں کر سکتا کہ سوال حدیث کے بارے میں کیا جائے اور وہ جو اب قرآن کے بارے میں دینے لگے۔ اس قسم کے جھوٹے قصے کہانیوں نے ہمارے بیشتر لٹریچر کو غیر سائنٹفک بنا دیا ہے۔ ان سے عقیدت مندی کا مزاج رکھنے والا آدمی تو فائدہ اٹھا سکتا ہے مگر علمی ذوق رکھنے والے آدمی کے لیے اس کی افادیت بہت کم ہے۔

24 اکتوبر 1985

خوارج کا یہ کہنا تھا کہ خلافت کسی قوم یا قبیلے کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ ہر وہ شخص خلیفہ بن سکتا ہے جس کے اندر خلافت کی شرطیں پائی جائیں۔ بظاہر یہ ایک صحیح بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ صحابی رسول علی ابن ابی طالب کے الفاظ میں کَلِمَةً حَقِّیْ اُرِیدَ ہَا بِاطِلَکَ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1066) کی مثال ہے، یعنی ایک حق بات جس سے باطل مطلوب ہے۔

اصل یہ ہے کہ عرب دو بڑے قبائلی گروہوں میں منقسم تھے — مُضَر اور رِبیعہ۔ قریش کا تعلق مضر سے تھا، اور خوارج زیادہ تر قبیلہ رِبیعہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ مضر اور قبیلہ رِبیعہ میں جاہلیت کے زمانے سے عداوت چلی آرہی تھی۔ صحابہ کرام نے جب عرب کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے قریش میں سے خلیفہ کا انتخاب کیا تو قبیلہ رِبیعہ کے لوگ بگڑ گئے۔ کیوں کہ قریش کا تعلق قبیلہ مضر سے تھا۔ ایسی حالت میں خوارج جو اصول پیش کرتے تھے، اس کا مقصد اپنے قبیلے کے حق میں خلافت کا استحقاق ثابت کرنا تھا، نہ کہ اہل ترخص کے حق میں اس کا استحقاق ثابت کرنا۔

25 اکتوبر 1985

عہدِ وسطیٰ میں شہنشاہ اور پوپ کے درمیان جو جھگڑے ہوئے، ان میں ساری بحث اس پر تھی کہ حضرت عیسیٰ (یا خدا) نے دنیا کی حکومت پوپ کے سپرد کی ہے یا شہنشاہ کے، اور اگر ان دونوں میں اختلاف ہو تو قوم کو کس کے حکم پر چلنا چاہیے۔

آج یہ بحث بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ آج حکومت و سیاست کے معاملات میں نہ ”مسیح“ کا دخل ہے اور نہ ”پوپ“ کا۔ آج ان معاملات میں ساری حیثیت عوام کی مانی جاتی ہے یا

عوام کے منتخب نمائندوں کی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زمانی حالات کتنا زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی فکر کی عمومی کامیابی کا انحصار تمام تر اسی پر ہوتا ہے کہ زمانی حالات اس کے موافق ہیں یا اس کے خلاف۔ آدمی اگر حکومت کے نظام میں تبدیلی لانا چاہتا ہے تو اس سے پہلے اس کو لوگوں کی سوچ میں تبدیلی لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ حکومت کے نظام میں کوئی حقیقی تبدیلی لانے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

26 اکتوبر 1985

نکاراؤ کے میدان سے ہٹنا آدمی کو تعمیر کا وقفہ عطا کرتا ہے۔ اور اس دنیا میں وقفہ تعمیر کو پانا ہی کسی آدمی کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ ایک پچھڑے ہوئے گروہ کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ وہ اپنے لیے وقفہ تعمیر کو پالے۔ اس وقفہ تعمیر کو حاصل کرنے کی واحد لازمی قیمت یہ ہے کہ پچھڑا ہوا گروہ نزع کے مقام سے اپنے آپ کو ہٹائے۔

اس دنیا میں آدمی ہمیشہ دو چیزوں کے درمیان ہوتا ہے۔ مسائل اور مواقع۔ عقلمند وہ ہے جو مسائل کو مستقبل کے خانے میں ڈال دے اور اپنی ساری طاقت مواقع کو استعمال کرنے میں لگائے۔ مسائل میں الجھ کر وہ دونوں کو کھوئے گا، جب کہ مواقع کو استعمال کر کے وہ بالآخر دونوں کو پالے گا۔ یہی بات ہے جس کو ایک مفکر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔ مسائل کو بھوکا رکھو، مواقع کو کھلاؤ:

Starve the Problems, Feed the Opportunities.

1 نومبر 1985

انسانوں میں کچھ کم صلاحیت کے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ اعلیٰ صلاحیت کے لوگ۔ اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّبِعُوا فِئَةً مِّنْهُمْ** (43:32)۔ یعنی اور ہم نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے سے کام لیں۔

کم تر صلاحیت کے لوگ اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ کسی کے پیچھے چلیں۔ یہ صرف اعلیٰ

صلاحیت کے افراد ہیں جو تاریخ بناتے ہیں۔ اونچی صلاحیت کے افراد کوئی بڑا کام صرف اس وقت کر پاتے ہیں جب کہ وہ ”صبر“ کی سطح پر کام کرنے کے لیے راضی ہوں۔ اس سلسلے میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَقْرَبِ نَا لِكَمَا صَبَرُوا (32:24)**۔ یعنی اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے، جب کہ انہوں نے صبر کیا۔

بڑا کام کرنے کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی چھوٹا کام کرنے پر اپنے آپ کو راضی کر سکے۔ زندگی کی تعمیر میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو گم نامی میں جانا پڑتا ہے۔ اس کو کبھی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ اس کو ایسا کام کرنا پڑتا ہے جس میں اس پر بزدلی اور مصالحت کا الزام لگایا جائے۔

موجودہ زمانے میں بہت سے اعلیٰ صلاحیت کے افراد پیدا ہوئے۔ مگر ان میں سے ہر شخص کا یہ حال ہوا کہ اس کا اپنا شخصی گنبد تو کھڑا ہو گیا مگر اس کے ذریعہ سے ملت کا محل تعمیر نہ ہو سکا۔ اس کی واحد سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی حوصلہ مندی ان کے لیے ”چھوٹا کام“ کرنے میں مانع ہو گئی۔ ان میں سے ہر شخص ایسے کاموں کے پیچھے دوڑتا رہا جن کو بڑے بڑے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہو۔ ایسا عمل صرف شخصیتیں بناتا ہے، وہ قوموں کی تعمیر نہیں کرتا۔

2 نومبر 1985

میں اکثر سوچتا تھا کہ درخت اتنے زیادہ حسین کیوں معلوم ہوتے ہیں۔ آخر اس کی وجہ یہ سمجھ میں آئی کہ درخت دوسروں کی زندگی میں دخل نہیں دیتے۔ ہر درخت اپنے آپ میں جیتا ہے۔ ہر درخت اپنا رزق خود حاصل کرتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ دنیا سے جتنا لیتا ہے اس سے زیادہ وہ دنیا کو لوٹاتا ہے۔ وہ دنیا سے ”مٹی اور پانی“ جیسی چیزیں لیتا ہے مگر وہ اس کو ہریالی اور پھول اور پھل کی صورت میں واپس کرتا ہے۔

انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ انسان دوسروں کی زندگی میں مداخلت کر کے انہیں مشتعل کرتا ہے۔ وہ دوسروں کا استحصال کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو کچھ نہ دے اور دوسروں سے ان کا سب کچھ لے لے۔ یہی فرق ہے جس نے درخت کو ہر ایک کے لیے پرکشش بنا دیا

ہے۔ اور انسان کو ایسا بنا دیا ہے جس میں دوسروں کے لیے کوئی کشش نہیں۔

4 نومبر 1985

ہندستانی مسلمانوں کی تقریریں اور تحریریں پڑھیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا کہ وہی ہیں جنہوں نے ہندستان کو آزادی دلائی۔ وہی ہیں جنہوں نے سردھڑکی بازی لگا کر ہندستان کو بیرونی سیاسی قبضہ سے آزاد کیا۔ مگر آزادی کے بعد لکھنے والوں نے ہندستان کی جو تاریخ لکھی ہے اس میں مسلمانوں کی کوئی حیثیت نہیں۔ تاریخ آزادی ہند میں مسلمان صرف تاریخ کے فوٹ نوٹ (footnote of history) بن کر رہ گئے ہیں۔

بڑا کام وہ ہے جس کا اعتراف کرنے پر دوسرے لوگ مجبور ہو جائیں۔ جو کام ہمارے اپنے ذہنی سانچے میں بڑا ہو، اور اس سے باہر جاتے ہی وہ چھوٹا ہو جائے وہ دراصل بڑا کام تھا ہی نہیں۔

5 نومبر 1985

ہر انسان کے اوپر فطرت کا ایک چوکی دار مقرر ہے، جو اس کو برائی سے روکتا ہے۔ یہ حیا اور شرم کا جذبہ ہے۔ جس آدمی کے اندر حیا نہ رہے، اس کے اندر گویا برائی کا آخری روک باقی نہ رہا۔ حیا کے سلسلے میں دو روایتیں یہ ہیں:

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النَّبِيِّ، إِذَا لَمْ تَسْتَحِيْ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3483)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: نبوت کے ذریعے لوگوں کو جو بات ملی، ان میں سے ایک بات یہ ہے: جب تمہارے اندر شرم نہ رہے تو جو چاہے کرو۔

علقمہ بن علاش نے سے کہا: يَا رَسُولَ اللَّهِ عِظْنِي. فَقَالَ النَّبِيُّ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - اسْتَحِ مِنَ اللَّهِ تَعَالَى اسْتِحْيَاءَكَ مِنْ ذَوِي الْهَيْبَةِ مِنْ قَوْمِكَ (ادب الدنيا والدين للماوردي، صفحہ 249)۔ یعنی اے خدا کے رسول! مجھے نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا: اللہ سے اس طرح حیا کرو جس طرح تم اپنی قوم کی پرہیزگاری پر ہیبت شخصیتوں سے حیا کرتے ہو۔

## اعلان

انسانیت کی تعمیر میں عورت کا ایک اہم رول ہے۔ مگر پوری تاریخ میں عورتوں کو انڈری یوٹیلایزڈ (underutilized) کیا گیا ہے۔ مولانا وحید الدین خاں صاحب نے اسلامی تاریخ میں حضرت ہاجرہ اور دوسری خواتین کے رول کو دریافت کیا، اور اس کو ایکسپلین کر کے عورتوں کو ترغیب دی کہ وہ ان کے نقش قدم پر چلیں، اور اپنے potential کو ایکنچو لائز (actualize) کر کے وہ تاریخ دہرائیں، جو تاریخ ان خواتین نے بنائی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے قرآن و سنت اور تاریخ کے حوالے سے کئی کتابیں لکھی ہیں، جیسے ”عورت معمارِ انسانیت“، ”خاتون اسلام“۔ اب ان کی رہنمائی میں سی پی ایس لیڈیز نے ایک دعوتی گروپ شروع کیا جس کا نام ہے:

### CPS Ladies International

اس گروپ میں انڈیا اور انڈیا کے باہر کی خواتین شامل ہیں۔ یہاں وہ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اپنی ضرورت کے اعتبار سے ڈسکشن کرتی ہیں، جس سے ان کو دین کی گہری معرفت (deeper realization) حاصل ہوتی ہے، اور ان کا انگلکچول ڈولپمنٹ ہوتا ہے۔ یہ گروپ 29 اکتوبر 2020 کو شروع ہوا، اور اتنے کم وقت میں خواتین نے جو فیڈ بیک دیا، وہ بہت ہی حیرت انگیز (amazing) ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی زندگی میں مثبت تبدیلی آئی۔ انھوں نے اس گروپ کو جوائن کر کے حقیقی اسلام کو سمجھا ہے۔ اس سے پہلے ان کے نزدیک اسلام کا مطلب کچھ سماجی رسوم تھا، نہ کہ وہ اسلام جو اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے بھیجا ہے۔

اب ہم لوگوں نے آن لائن قرآن کلاس کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت ہماری ہفتہ وار آن لائن قرآن کلاس شروع ہو چکی ہے۔ اس سے ہمیں قرآن کے پیغام کو تندرستی سے سمجھنے اور عملی زندگی میں اپنانے کا موقع ملتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ گروپ جدید سائنسی دور میں ہاجرہ کلچر کے احیا (revive) کا ذریعہ بنے گا، یعنی بے مثال جدوجہد کے ذریعے خدائی دین کو جدید معیار پر ثابت شدہ بنانا۔

سی پی ایس لیڈیز انٹرنیشنل سے اگر کوئی خاتون جڑنا چاہتی ہیں تو اس ای میل یا واٹس ایپ پر اپنا نام اور نمبر بھیجیں:

fahmidakhan245@gmail.com

واٹس ایپ 09453215285

# مولانا وحید الدین خاں کی کتابیں رعایتی قیمت پر دستیاب ہیں

₹ 40	Hadees-e-Rasool	حدیثِ رسول
₹ 20	Hajj ka Paigam	حج کا پیغام
₹ 40	Hal Yahan Hai	حل یہاں ہے
₹ 30	Haqeeqat Ki Talaash	حقیقت کی تلاش
₹ 50	Haqeeqat-e-Hajj	حقیقتِ حج
₹ 10	Haqeeqat-e-Tawhid	حقیقتِ توحید - بک لیٹ
₹ 100	Hikmat-e-Islam	حکمتِ اسلام
₹ 90	Hind-Pak Diary	ہند-پاک ڈائری
₹ 10	Hindustan Aazadi Ke Baad	ہندستان آزادی کے بعد
₹ 70	Hindustani Musalman	ہندستانی مسلمان
₹ 30	Imani Taqat	ایمان کی طاقت
₹ 60	Insaan ki Manzil	انسان کی منزل
₹ 60	Islam aur Asre Hazir	اسلام اور عصرِ حاضر
₹ 50	Islam Daur-e-Jadid Ka Khaliq	اسلام دورِ جدید کا خالق
₹ 30	Islam Deen-e-Fitrat	اسلام دینِ فطرت
₹ 10	Islam Ek Azeem Jad-o-Jahad	اسلام ایک عظیم جدوجہد
₹ 10	Islam Ka Taaruf	اسلام کا تعارف
₹ 30	Islam Kiya Hai?	اسلام کیا ہے؟
₹ 90	Islam: Ek Ta'aruf	اسلام: ایک تعارف
₹ 30	Islami Dawat	اسلامی دعوت
₹ 10	Islami Jihad	اسلامی جہاد
₹ 60	Islami Taalimaat	اسلامی تعلیمات
₹ 60	Islami Zindagi	اسلامی زندگی
₹ 30	Ittehad-e-Millat	اتحادِ ملت
₹ 230	Izhaar-e-Deen	اظہارِ دین
₹ 80	Karwan-e-Millat	کاروانِ ملت
₹ 30	Khaleej-e-Diary	خلیجِ ڈائری
₹ 30	Khoda aur Insaan	خدا اور انسان

₹ 30	Aakhri Safar	آخری کا سفر
₹ 10	Aakhirat ka Safar	آخرت کا سفر
₹ 50	Ahya-e-Islam	احیائے اسلام
₹ 60	Al-Islam	الاسلام
₹ 70	Al-Rabbaniah	الربانیہ
₹ 70	Amne-Aalam	امن عالم
₹ 60	Aqliat-e-Islam	عقلیاتِ اسلام
₹ 100	Asbaq-e-Tarikh	اسباقِ تاریخ
₹ 140	Asfar-e-Hind	اسفارِ ہند
₹ 10	Asma e Husna	اسمائے حسنی
₹ 60	Azmat-e-Islam	عظمتِ اسلام
₹ 60	Azmat-e-Islam	عظمتِ اسلام - بک لیٹ
₹ 20	Azmat-e-Momin	عظمتِ مومن - بک لیٹ
₹ 60	Azmat-e-Qur'an	عظمتِ قرآن
₹ 30	Azmat-e-Sahaba	عظمتِ صحابہ
₹ 50	Dawat-e-Haq	دعوتِ حق
₹ 70	Dawat-e-Islam	دعوتِ اسلام
₹ 10	Dawat Ilallah	دعوتِ الی اللہ
₹ 30	Deen ki Siyasi Taabeer	دین کی سیاسی تعبیر
₹ 20	Deen Kiya Hai?	دین کیا ہے؟
₹ 100	Deen wa Shari'at	دین و شریعت
₹ 90	Deen-e-Insaniyat	دینِ انسانیت
₹ 100	Deen-e-Kamil	دینِ کامل
₹ 30	Deeni Taaleem	دینی تعلیم
₹ 100	Diary Vol. I 83-84	ڈائری (حصہ اول)
₹ 120	Diary 89-90	ڈائری - 1989-90
₹ 100	Diary 91-92	ڈائری - 91-92
₹ 20	Fikr-e-Islami	فکرِ اسلامی



₹ 60	Socialism Aur Islam	سوشلزم اور اسلام
₹ 10	Taareekh Dawat-e-Haq	تاریخ دعوتِ حق
₹ 20	Taaruf-e-Islam	تعارف اسلام
₹ 30	Tablighi Tahreek	تبلیغی تحریک
₹ 40	Tajdeed-e-Deen	تجدیدِ دین
₹ 10	Talaq Islam Mein	طلاقِ اسلام میں
₹ 90	Tameer-e-Hayat	تعمیرِ حیات
₹ 70	Tameer-e-Insaniyat	تعمیرِ انسانیت
₹ 30	Tameer-e-Millat	تعمیرِ ملت
₹ 30	Tareekh Ka Sabaq	تاریخ کا سبق
₹ 100	Tasweer-e-Millat	تصویرِ ملت
₹ 40	Tarjuma-e-Quran	ترجمہ قرآن
₹ 10	Tazkiya-e-Nafs	تزکیہِ نفس
₹ 30	Ummahat-ul-Mumeneen	امہات المؤمنین
₹ 30	Zalzal-e-Qiyamat	زلزلہ قیامت
₹ 60	Zuhoor-e-Islam	ظہورِ اسلام
₹ 80	Arabic version of God Arises	الاسلام ہتھدی
₹ 40	Tarbiyat-e-Aulad	ترہیتِ اولاد
₹ 10	Mansoobaband Amal	منصوبہ بند عمل
₹ 100	Sawal Wa Jawab	سوال و جواب
₹ 50	Marxism: Tareekh Jisko Radd Kar Chuki Hai	مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے
₹ 80	Masa'le Ejtehaad	مسائلِ اجتہاد
₹ 20	Islam Pandrahwin Sadi Mein	اسلام پندرہویں صدی میں
₹ 30	Taameer Ki Taraf	تعمیر کی طرف

₹ 10	Manzil Ki Taraf	منزل کی طرف
₹ 10	Maqсад-e-Hayat	مقصدِ حیات
₹ 60	Mazameen-e-Islam	مضامینِ اسلام
₹ 70	Mewat Ka Safar	میوات کا سفر
₹ 70	Mutala-e-Seerat	مطالعہ سیرت
₹ 20	Mutala-e-Seerat	مطالعہ سیرت - بکٹ لیٹ
₹ 30	Nar-e-Jahannam	نارِ جہنم
₹ 80	Nashri Taqirren	نشری تقریریں
₹ 30	Iama aur Daure Jadid	علماء اور دورِ جدید
₹ 10	Paighambar-e-Islam	پیغمبرِ اسلام
₹ 80	Qalallah Qallar Rasool	قال اللہ، قال الرسول
₹ 30	Qiyadat Nama	قیادت نامہ
₹ 10	Qiyamat ka Alarm	قیامت کا الارم
₹ 30	Qur'an Ka Mattoob Insan	قرآن کا مطلوب انسان
₹ 60	Rah-e-Amal	راہِ عمل
₹ 30	Rahen Band Nahin	راہیں بند نہیں
₹ 30	Rahnuma-e-Hayat	رہنمائے حیات (کتابچہ)
₹ 70	Rahnuma-e-Hayat	رہنمائے حیات
₹ 20	Roshan Mustaqbil	روشن مستقبل
₹ 30	Sabaq Aamoz Waqiat	سبق آموز واقعات
₹ 10	Sachcha Rasta	سچا راستہ
₹ 50	Safarnama Spain wa Falasteen	سفر نامہ اسپین و فلسطین
₹ 80	Safar-e-Hayat	سفرِ حیات
₹ 30	Saum-e-Ramzan	صومِ رمضان
₹ 70	Shatme Rasool Ka Masla	ششم رسول کا مسئلہ
₹ 70	Sirat-e-Mustaqeem	صراطِ مستقیم
₹ 30	Socialism: Ek Ghair Islami Nazaria	سوشلزم: ایک غیر اسلامی نظریہ

## دعوت اور معرفت

